رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۲۰۳

شعبان المعظم ۱۳۷۰ھ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت فی پرچہ دس آنے

قیمت سالانہ چھ روپے

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین پر مولانا نے ہر طرح کے سوالات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

جلد شائع ہو رہی ہے

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(١٦)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(٣٤)	,,
خلافیات	(١٥)	,,
عام مسائل	(٧)	,,
معاشی مسائل	(١٥)	,,
سیاسی مسائل	(١٠)	,,

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۶، ۱	جمادی الثانی، رجب ۱۳۷۲ھ مطابق مارچ، اپریل ۱۹۵۳ء	جلد ۳۹، ۴۰

ابوالخیر مودودی پرنٹر و پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

تفہیم القرآن

مریم

(۴)

اور ذکر کرو اس کتاب میں موسیٰ کا۔ وہ ایک چیدہ شخص[1] تھا اور رسول نبی[2] تھا۔ ہم نے اُس کو طُور کے داہنی

---

[1] اصل میں لفظ مُخلَص استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں "خالص کیا ہوا"۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ ایک ایسے شخص تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے خالص اپنا کر لیا تھا۔

[2] "رسول" کے معنی ہیں "فرستادہ، بھیجا ہوا"۔ اسی معنی کے لحاظ سے عربی زبان میں قاصد، پیغام بر، ایلچی اور سفیر کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور قرآن میں یہ لفظ یا تو اُن ملائکہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کارِ خاص پر بھیجے جاتے ہیں، یا پھر اُن انسانوں کو اس نام سے موسوم کیا گیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے خلق کی طرف اپنا پیغام پہنچانے کے لیے مامور فرمایا۔

نبی کے معنی میں اہلِ لغت کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اس کو لفظ نَبَاء سے مشتق قرار دیتے ہیں جس کے معنی خبر کے ہیں، اور اس اصل کے لحاظ سے نبی کے معنی "خبر دینے والے" کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کا مادہ نُبُو ہے، یعنی رفعت اور بلندی۔ اور اس معنی کے لحاظ سے نبی کا مطلب ہے "بلند مرتبہ" اور "عالی مقام"۔ ازہری نے کسائی سے ایک تیسرا قول نقل کیا ہے کہ یہ لفظ نَبِی سے ہے جس کے معنی طریق اور راستے کے ہیں، اور انبیاء کو نبی اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کی طرف جانے کا راستہ ہیں۔

پس کسی شخص کو "رسول نبی" کہنے کا مطلب یا تو "عالی مقام پیغمبر" ہے، یا "اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبریں دینے والا پیغمبر"، یا پھر "وہ پیغمبر جو اللہ کا راستہ بتانے والا ہے"۔

قرآن مجید میں یہ دونوں الفاظ بالعموم ہم معنی استعمال ہوئے ہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی شخصیت کو (باقی ۲۶۳)

جانب سے پکارا[۳۲] اور راز کی گفتگو سے اس کو تقرب عطا کیا[۳۳]، اور اپنی مہربانی سے اس کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر اُسے (مددگار کے طور پر) دیا۔

اور اس کتاب میں اسماعیل کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کا سچا تھا اور رسول نبی تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک ایک پسندیدہ انسان تھا۔

(بقیہ حاشیہ ۳۶۳) کہیں صرف رسول کہا گیا ہے اور کہیں صرف نبی اور کہیں رسول اور نبی ایک ساتھ۔ لیکن بعض مقامات پر رسول اور نبی کے الفاظ اس طرح بھی استعمال ہوئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مرتبے یا کام کی نوعیت کے لحاظ سے کوئی اصطلاحی فرق ہے۔ مثلاً سورۂ حج، رکوع ۷ میں فرمایا وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَّلَا نَبِيٍّ إِلَّا ... "ہم نے تم سے پہلے نہیں بھیجا کوئی رسول اور نہ نبی مگر ..." یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ رسول اور نبی دو الگ اصطلاحیں ہیں جن کے درمیان کوئی معنوی فرق ضرور ہے۔ اسی بنا پر اہل تفسیر میں یہ بحث چل پڑی ہے کہ اس فرق کی نوعیت کیا ہے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قطعی دلائل کے ساتھ کوئی بھی رسول اور نبی کی الگ الگ حیثیتوں کا تعین نہیں کر سکا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ نبی کی بہ نسبت خاص ہے، یعنی ہر رسول نبی بھی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا، یا بالفاظ دیگر انبیاء میں سے رسول کا لفظ ان جلیل القدر ہستیوں کے لیے بولا گیا ہے جن کو عام انبیاء کی بہ نسبت زیادہ اہم منصب سپرد کیا گیا تھا۔ اسی کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام احمد نے حضرت ابو امامہ سے اور حاکم نے حضرت ابوذر سے نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رسولوں کی تعداد پوچھی گئی تو آپ نے ۳۱۳ یا ۳۱۵ بتائی اور انبیاء کی تعداد پوچھی گئی تو آپ نے ایک لاکھ ۲۴ ہزار بتائی۔ اگرچہ اس حدیث کی سندیں ضعیف ہیں، مگر کئی سندوں سے ایک بات کا نقل ہونا اس کے ضعف کو بڑی حد تک دور کر دیتا ہے۔

[۳۲] کوہ طور کے داہنی جانب سے مراد اس کا مشرقی دامن ہے۔ چونکہ حضرت موسیٰ مدین سے مصر جاتے ہوئے اس راستے سے گزر رہے تھے جو کوہ طور کے جنوب سے جاتا ہے، اور جنوب کی طرف سے اگر کوئی شخص طور کو دیکھے تو اس کے دائیں جانب مشرق اور بائیں جانب مغرب ہوگا، اس لیے حضرت موسیٰ کی نسبت سے طور کے مشرقی دامن کو "داہنی جانب" فرمایا گیا، ورنہ ظاہر ہے کہ بجائے خود پہاڑ کا کوئی دایاں یا بایاں رخ نہیں ہوتا۔

[۳۳] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ نساء، حاشیہ نمبر ۲۰۶

اور اس کتاب میں ادریسؑ کا ذکر کرو۔ وہ ایک   باز انسان اور ایک نبی تھا اور اسے ہم نے بلند مقام پر اٹھایا تھا۔

۱؎ حضرت ادریس کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک وہ بنی اسرائیل میں سے کوئی نبی تھے۔ مگر اکثریت اس طرف گئی ہے کہ وہ حضرت نوح سے بھی پہلے گزرے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث ہم کو ایسی نہیں ملی جس سے ان کی شخصیت کے تعین میں کوئی مدد ملتی ہو۔ البتہ قرآن کا ایک اشارہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ وہ حضرت نوح سے متقدم ہیں۔ کیونکہ بعد والی آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ انبیاء (جن کا ذکر اوپر گزرا ہے) آدم کی اولاد، نوح کی اولاد، ابراہیم کی اولاد اور اسرائیل کی اولاد سے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰ، عیسیٰ اور موسیٰ علیہم السلام تو بنی اسرائیل میں سے ہیں، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب اولاد ابراہیم سے ہیں اور حضرت ابراہیم اولاد نوح سے۔ اس کے بعد صرف حضرت ادریس ہی رہ جاتے ہیں جن کے متعلق یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ اولاد آدم سے ہیں۔

مفسرین کا عام خیال یہ ہے کہ بائیبل میں جن بزرگ کا نام حنوک (Enoch) بتایا گیا ہے، وہی حضرت ادریس ہیں۔ ان کے متعلق بائیبل کا بیان یہ ہے:-

"اور حنوک پینسٹھ برس کا تھا جب اس سے متوسلح پیدا ہوا اور متوسلح کی پیدائش کے بعد حنوک تین سو برس تک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا ... اور وہ غائب ہو گیا کیونکہ خدا نے اسے اٹھا لیا"۔

(پیدائش، باب ۵۔ آیت ۲۱-۲۴)

تلمود کی اسرائیلی روایات میں ان کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بتائے گئے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نوح سے پہلے جب بنی آدم میں بگاڑ کی ابتدا ہوئی تو خدا کے فرشتے نے حنوک کو، جو لوگوں سے الگ تھلگ زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے، پکارا کہ "اے حنوک، اٹھو، گوشۂ عزلت سے نکلو اور زمین کے باشندوں میں چل پھر کر ان کو وہ راستہ بتاؤ جس پر ان کو چلنا چاہیے اور وہ طریقے بتاؤ جن پر انہیں عمل کرنا چاہیے"۔ یہ حکم پا کر وہ نکلے اور انہوں نے جگہ جگہ لوگوں کو جمع کر کے وعظ و تلقین کی اور نسل انسانی نے ان کی اطاعت قبول کر کے اللہ کی بندگی اختیار کر لی۔ حنوک ۳۵۳ برس تک نسل انسانی پر حکمران رہے۔ ان کی حکومت انصاف اور حق پرستی کی حکومت تھی۔ ان کے عہد میں زمین پر خدا کی رحمتیں برستی رہیں۔

۲؎ اس کا سیدھا سادھا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس کو بلند مرتبہ عطا کیا تھا لیکن روایات میں

یہ وہ پیغمبر ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا آدم کی اولاد میں سے، اور ان لوگوں کی نسل سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا، اور ابراہیم کی نسل سے اور اسرائیل کی نسل سے۔ اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور برگزیدہ کیا۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب رحمان کی آیات ان کو سنائی جاتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے۔ سجدہ

پھر ان کے بعد وہ ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا[1] اور خواہشات نفس کی پیروی کی[2]۔ پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں۔ البتہ جو توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں اور نیک عمل اختیار کر لیں وہ جنت میں داخل ہونگے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہوگی۔ ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن کا رحمان نے اپنے بندوں سے در پردہ وعدہ کر رکھا ہے[3] اور یقیناً یہ وعدہ پورا ہو کر رہنا ہے۔ وہاں وہ کوئی بیہودہ بات نہ سنیں گے، جو کچھ بھی سنیں گے ٹھیک ہی سنیں گے[4]۔ اور ان کا رزق انہیں پیہم

(بقیہ حاشیہ ص ۳۶۴) اسرائیلی روایات سے منتقل ہو کر یہ بات ہمارے ہاں بھی مشہور ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس کو آسمان پر اٹھا لیا۔ بائیبل میں تو صرف اسی قدر ہے کہ وہ غائب ہو گئے کیونکہ "خدا نے ان کو اٹھا لیا"، مگر تلمود میں اس کا ایک طویل قصہ بیان ہوا ہے جس کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ "حنوک ایک بگولے میں آتشیں رتھ اور گھوڑوں سمیت آسمان پر چڑھ گئے"۔

[1] یعنی نماز پڑھنی چھوڑ دی، یا نماز سے غفلت اور بے پرواہی برتنے لگے۔ یہ ہر امت کے زوال و انحطاط کا پہلا قدم ہے۔ نماز وہ اولین رابطہ ہے جو مومن کا زندہ اور عملی تعلق خدا کے ساتھ شب و روز جوڑے رکھتا ہے اور اسے خدا پرستی کے مرکز و محور سے بچھڑنے نہیں دیتا۔ یہ بندھن ٹوٹتے ہی آدمی خدا سے دور اور دور تر ہوتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ عملی تعلق سے گزر کر اس کا خیالی تعلق بھی خدا کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بات ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر بیان فرمائی ہے کہ پچھلے تمام انبیاء کی امتوں کا بگاڑ نماز ضائع کرنے سے شروع ہوا ہے۔

[2] یہ تعلق باللہ کی اور اس کے فقدان کا لازمی نتیجہ ہے۔ نماز کی اضاعت سے جب دل خدا کی یاد سے غافل رہنے لگے تو جوں جوں یہ غفلت بڑھتی گئی خواہشات نفس کی بندگی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ ان کے اخلاق اور معاملات کا ہر گوشہ احکام الٰہی کے بجائے اپنے من مانے طریقوں کا پابند ہو کر رہا۔

[3] یعنی جس کا وعدہ رحمان نے اس حالت میں کیا ہے کہ وہ جنتیں اُن کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں۔

[4] یہ حاشیہ ۶۵ [illegible] رد کیجئے۔

صبح و شام ملتا رہے گا۔ یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اُس کو بنائیں گے جو پرہیزگار رہا ہے۔

اے محمدؐ، ہم تمہارے رب کے حکم کے بغیر نہیں اترا کرتے۔ جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے ہر چیز کا مالک وہی ہے اور تمہارا رب بھولنے والا نہیں ہے۔ وہ رب ہے

(حاشیہ صفحہ سابق) ۳۷ اصل میں لفظ "سلام" استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں عیب اور نقص سے محفوظ۔ جنت میں جو نعمتیں انسان کو میسر ہوں گی ان میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہوگی کہ وہاں کوئی بیہودہ اور فضول اور گندی بات سننے میں نہ آئے گی۔ وہاں کا پورا معاشرہ ایک ستھرا اور سنجیدہ اور پاکیزہ معاشرہ ہوگا جس کا ہر فرد سلیم الطبع ہوگا۔ وہاں کے رہنے والوں کو غیبتوں اور گالیوں اور فحش گانوں اور دوسری بری آوازوں کی سماعت سے پوری نجات مل جائے گی۔ وہاں آدمی جو کچھ بھی سنے گا بھلی اور معقول اور بجا باتیں ہی سنے گا۔

اس نعمت کی قدر وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو اس دنیا میں فی الواقع ایک پاکیزہ اور ستھرا ذوق رکھتا ہو، کیونکہ وہی یہ محسوس کر سکتا ہے کہ انسان کے لیے ایک ایسی گندی سوسائٹی میں رہنا کتنی بڑی مصیبت ہے جہاں کسی وقت بھی اس کے کان جھوٹ، غیبت، فتنہ و فساد، شرارت، گندگی اور شہوانیت کی باتوں سے محفوظ نہ ہوں۔

۳۸ یہ پورا پیراگراف ایک جملہ معترضہ ہے جو ایک سلسلۂ کلام کو ختم کر کے دوسرا سلسلۂ کلام شروع کرنے سے پہلے ارشاد ہوا ہے۔ انداز کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ سورۃ بڑی دیر کے بعد ایسے زمانے میں نازل ہوئی ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ بڑے اضطراب انگیز حالات سے گزر رہے ہیں۔ حضورؐ کو اور آپ کے صحابیوں کو ہر وقت وحی کا انتظار ہے تاکہ اس سے رہنمائی بھی ملے اور تسلی بھی حاصل ہو۔ جوں جوں وحی آنے میں دیر ہو رہی ہے اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔ اس حالت میں جبریل علیہ السلام فرشتوں کے جھرمٹ میں تشریف لاتے ہیں۔ پہلے وہ فرمان سناتے ہیں جو موقع کی ضرورت کے لحاظ سے فوراً درکار تھا، پھر آگے بڑھنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے اشارے سے یہ چند کلمات اپنی طرف سے کہتے ہیں جن میں اتنی دیر تک اپنے حاضر نہ ہونے کی معذرت بھی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرفِ تسلی بھی، اور ساتھ ساتھ صبر و ضبط کی تلقین بھی۔

یہ صرف کلام کی اندرونی شہادت ہی نہیں ہے بلکہ متعدد روایات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں جنہیں ابن جریر، ابن کثیر اور صاحب روح المعانی وغیرہم نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

آسمانوں کا اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں۔ پس تم اس کی بندگی کرو اور اسی کی بندگی پہ ثابت قدم رہو۔[1] کیا۔ ہے کوئی ہستی تمہارے علم میں اس کی ہم پایہ؟[2] ع

انسان کہتا ہے کیا واقعی جب میں مر چکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لایا جاؤں گا؟ کیا انسان کو یہ یاد نہیں آتا کہ ہم پہلے اس کو پیدا کر چکے ہیں جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھا؟ تیرے رب کی قسم ہم ضرور ان سب کو اور ان کے ساتھ شیاطین[3] کو بھی گھیر لائیں گے، پھر جہنم کے گرد لا کر انہیں گھٹنوں کے بل گرا دیں گے، پھر ہر گروہ میں سے ہر اس شخص کو چھانٹ لیں گے جو رحمان کے مقابلے میں زیادہ سرکش بنا ہوا تھا،[4] پھر یہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے کون سب سے بڑھ کر جہنم میں جھونکے جانے کا مستحق ہے۔ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو جہنم پر وارد نہ ہو۔[5]

---

[1] یعنی اس کی بندگی کے راستے پر مضبوطی کے ساتھ چلو اور اس راہ میں جو مشکلات اور مصائب بھی پیش آئیں ان کا صبر کے ساتھ مقابلہ کرو۔ اگر اس کی طرف سے یاد فرمائی اور مدد اور تسلی میں کبھی دیر لگ جایا کرے تو اس پر گھبراؤ نہیں۔ ایک مطیع فرمان بندے کی طرح ہر حال میں اس کی مشیت پر راضی رہو اور پورے عزم کے ساتھ وہ خدمت انجام دیے جاؤ جو ایک بندے اور رسول کی حیثیت سے تمہارے سپرد کیا گیا ہے۔

[2] اصل میں لفظ سَمِیّ استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنی "ہم نام" کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تو الٰہ ہے، کیا کوئی دوسرا الٰہ بھی تمہارے علم میں ہے؟ اگر نہیں ہے اور تم جانتے ہو کہ نہیں ہے تو پھر تمہارے لیے اس کے سوا اور راستہ ہی کیا ہے کہ اس کی بندگی کرو اور اس کے حکم کے بندے بن کر رہو۔

[3] یعنی اُن شیاطین کو جن کے یہ چیلے بنے ہوئے ہیں اور جن کے سکھائے پڑھائے میں آ کر انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں جہاں ہمیں خدا کے سامنے حاضر ہونا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہو۔

[4] یعنی ہر باغی گروہ کا لیڈر۔

[5] وارد ہونے کے معنی بعض روایات میں داخل ہونے کے بیان کیے گئے ہیں، مگر ان میں سے کسی کی سند بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک قابلِ اعتماد ذرائع سے نہیں پہنچتی۔ اور پھر یہ بات قرآن مجید اور اُن کثیر التعداد صحیح احادیث کے بھی خلاف ہے جن میں مومنین صالحین کے دوزخ میں جانے کی قطعی نفی کی گئی ہے۔ مزید برآں لغت میں بھی (باقی ص ۳۶۹ پر)

یہ تو ایک طے شدہ بات ہے جسے پورا کرنا تیرے رب کا ذمہ ہے۔ پھر ہم اُن لوگوں کو بچا لیں گے جو دنیا میں متقی تھے اور ظالموں کو اُسی میں گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔

اِن لوگوں کو جب ہماری کھلی کھلی آیات سنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں "بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے۔ اور کس کی مجلسیں زیادہ شاندار ہیں"؟ حالانکہ ان سے پہلے ہم کتنی ہی ایسی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ان سے زیادہ سر و سامان رکھتی تھیں اور ظاہری نشان و شوکت میں ان سے بڑھی ہوئی تھیں۔ ان سے کہو، جو شخص گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے اُسے رحمان ڈھیل دیا کرتا ہے، یہاں تک کہ جب ایسے لوگ وہ چیز دیکھ لیتے ہیں جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے ــــ خواہ وہ عذاب الٰہی ہو یا قیامت کی گھڑی ــــ تب انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کا حال خراب ہے اور کس کا جتھا کمزور! اس کے برعکس جو لوگ راہِ راست اختیار کرتے ہیں اللہ ان کو راست روی میں ترقی عطا فرماتا ہے اور باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک جزا اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہیں۔

پھر تو نے دیکھا اُس شخص کو جو ہماری آیات کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تو مال اور اولاد سے نوازا ہی جاتا رہوں گا؟ کیا اسے غیب کا پتہ چل گیا ہے یا اس نے رحمان سے کوئی عہد لے رکھا

(بقیہ حاشیہ ۳۶) ورود کے معنی دخول کے نہیں ہیں۔ اس لیے اس کا صحیح مطلب یہی ہے کہ جہنم پر گزر تو سب کا ہوگا مگر جیسا کہ بعد والی آیت بتا رہی ہے، پرہیزگار لوگ اس سے بچا لیے جائیں گے اور ظالم اس میں جھونک دیے جائیں گے۔

۱؎ یعنی ان کا استدلال یہ تھا کہ دیکھ لو، دنیا میں کون اللہ کے فضل اور اس کی نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے؟ کس کے گھر زیادہ شاندار ہیں؟ کس کا معیارِ زندگی زیادہ بلند ہے؟ کس کی محفلیں زیادہ ٹھاٹھ سے جمتی ہیں؟ اگر یہ سب کچھ ہمیں میسر ہے اور تم اس سے محروم ہو تو خود سوچ لو کہ آخر یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم باطل پر ہوتے اور یوں مزے اڑاتے اور تم حق پر ہوتے اور اس طرح خستہ و درماندہ رہتے؟

۲؎ یعنی ہر آزمائش کے موقع پر اللہ تعالیٰ ان کو صحیح فیصلے کرنے اور صحیح راستہ اختیار کرنے کی توفیق بخشتا ہے، اُن کو برائیوں اور غلطیوں سے بچاتا ہے اور اس کی ہدایت و رہنمائی سے وہ برابر راہِ راست پر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

۳؎ یعنی وہ کہتا ہے کہ تم مجھے خواہ کتنا ہی گمراہ و بدکار کہتے رہو اور عذاب الٰہی کے ڈراوے دیا کرو، (باقی حاشیہ ۔۔۔)

ہے ہ۔۔۔۔۔ ہرگز نہیں، جو کچھ یہ بکتا ہے اسے ہم لکھ لیں گے اور اس کے لیے سزا میں اور زیادہ اضافہ کریں گے

جس سر و سامان اور لاؤ لشکر کا یہ ذکر کر رہا ہے وہ سب ہمارے پاس رہ جائیگا اور یہ اکیلا ہمارے سامنے

حاضر ہو گا۔

اِن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے کچھ خدا بنا رکھے ہیں تاکہ وہ اِن کے پشتیبان ہوں[۲] ۔ کوئی پشتیبان

نہ ہوگا۔ وہ سب اِن کی عبادت کا انکار کریں گے[۳] اور اُلٹے اِن کے مخالف بن جائیں گے[۴]

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہم نے اِن منکرینِ حق پر شیاطین چھوڑ رکھے ہیں جو اِنہیں خوب خوب (مخالفتِ

حق پر) اُکسا رہے ہیں؟ اچھا، تو اب اِن پر نزولِ عذاب کے لیے بے تاب نہ ہو، ہم اِن کے دن گن رہے

ہیں[۵]۔ وہ دن آنے والا ہے جب متقی لوگوں کو ہم مہمانوں کی طرح رحمان کے حضور میں پیش کریں گے اور

مجرموں کو پیاسے جانوروں کی طرح جہنم کی طرف ہانک کر لائیں گے۔ اُس وقت لوگ کسی سفارش پر قادر

(بقیہ حاشیہ ۴۶۳) میں تو آج بھی تم سے زیادہ خوشحال ہوں اور آئندہ بھی مجھ پر نعمتوں کی بارش ہوتی رہے گی۔ میری

دولت دیکھو، میری وجاہت اور ریاست دیکھو، میرے نامور بیٹوں کو دیکھو، میری زندگی میں آخر تمہیں کہاں یہ

آثار نظر آتے ہیں کہ میں خدا کا مغضوب ہوں؟ ۔۔۔۔۔ یہ مکے میں کسی ایک شخص کے خیالات نہ تھے بلکہ کفار مکہ کا

ہر شیخ اور سردار اِسی خبط میں مبتلا تھا۔

[۱] یعنی اس کے جرائم کے ریکارڈ میں اُس کا یہ کلمۂ غرور بھی شامل کر لیا جائے گا اور اس کا مزا بھی اسے چکھنا پڑیگا۔

[۲] اصل میں لفظ عِزًّا استعمال ہوا ہے، یعنی وہ ان کے لیے سببِ عزت ہوں۔ مگر عزت سے مراد عربی زبان

میں کسی شخص کا ایسا طاقتور اور زبردست ہونا ہے کہ اس پر کوئی ہاتھ نہ ڈال سکے، اور ایک شخص کا دوسرے شخص کے لیے سببِ عزت بننا

یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اس کی حمایت پر ہو جس کی وجہ سے اُس کا کوئی مخالف اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔

[۳] یعنی وہ کہیں گے کہ نہ ہم نے کبھی اِن سے کہا تھا کہ ہماری عبادت کرو، اور نہ ہمیں یہ خبر تھی کہ یہ احمق

لوگ ہماری عبادت کر رہے ہیں۔

[۵] مطلب یہ ہے کہ ان کی زیادتیوں پر تم بے صبر نہ ہو، ان کی شامت قریب آ لگی ہے۔ پیمانہ بھرا جا رہا ہے۔

اللہ کی دی ہوئی مہلت کے کچھ دن باقی ہیں، انہیں پورا ہو لینے دو۔

نہ ہونگے بجز اُس کے جس نے رحمان کے حضور سے پروانہ حاصل کرلیا ہو[1]۔

وہ کہتے ہیں کہ رحمان نے کسی کو بیٹا بنایا ہے ____ سخت بیہودہ بات ہے جو تم لوگ گھڑ لائے ہو۔ قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں، اس بات پر کہ لوگوں نے رحمان کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا! رحمان کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ زمین اور آسمانوں کے اندر جو بھی ہیں سب اس کے حضور بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔ سب پر وہ محیط ہے اور اس نے ان کا شمار کر رکھا ہے۔ سب قیامت کے روز فرداً فرداً اس کے سامنے حاضر ہونگے۔

یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عمل صالح کر رہے ہیں عنقریب رحمان اُن کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا[2]۔ پس اے محمدؐ! اس کلام کو ہم نے آسان کر کے تمہاری زبان میں اسی لیے نازل کیا ہے کہ تم پرہیزگاروں کو خوشخبری دے دو اور ہٹ دھرم لوگوں کو ڈرا دو۔ ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں، پھر آج کہیں تم ان کا نشان پاتے ہو یا اُن کی بھنک بھی کہیں سنائی دیتی ہے؟

---

[1] یعنی سفارش اسی کے حق میں ہوگی جس نے پروانہ حاصل کیا ہو، اور وہی سفارش کر سکے گا جسے پروانہ ملا ہو۔ آیت کے الفاظ ایسے ہیں جو دونوں پہلوؤں پر یکساں روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ بات کہ سفارش صرف اسی کے حق میں ہو سکے گی جس نے رحمان سے پروانہ حاصل کر لیا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے دنیا میں ایمان لا کر اور خدا سے کچھ تعلق جوڑ کر اپنے آپ کو عفو و درگزر کا مستحق بنا لیا ہو۔ اور یہ بات کہ سفارش وہی کر سکے گا جس کو پروانہ ملا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے جن جن کو اپنا شفیع اور سفارشی سمجھ لیا ہے وہ سفارشیں کرنے کے مجاز نہ ہونگے بلکہ خدا خود جس کو اجازت دیگا وہی سفاعت کے لیے زبان کھول سکے گا۔

[2] یعنی آج مکّے کی گلیوں میں وہ ذلیل و رسوا کیے جا رہے ہیں، مگر یہ حالت دیرپا نہیں ہے۔ قریب ہے وہ وقت جبکہ اپنے اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کی وجہ سے وہ محبوب خلائق ہو کر رہیں گے۔ دل ان کی طرف کھچیں گے۔ دنیا اُن کے آگے پلکیں بچھائے گی۔

تزکیۂ نفس

تزکیہ کا لغوی مفہوم، اس کا مقصد، اور اسکی وسعت

(مولانا امین احسن اصلاحی)

عربی زبان میں تزکیہ کا مفہوم کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا، اس کو نشو ونما دینا اور اس کو پروان چڑھانا ہے۔
تزکیہ کا عمل مختلف چیزوں پر بظاہر مختلف شکلوں میں نمایاں ہوگا۔ مادّی چیزوں پر یہ عمل کسی اور شکل میں نمایاں ہوگا اور معنوی چیزوں پر کسی اور صورت میں۔ لیکن یہ فرق محض ایک ظاہری فرق ہوگا، حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوگا۔ لفظ کے اندر صاف ستھرا بنانے، نشو ونما دینے، اور پروان چڑھانے کی جو روح ہے وہ ہر جگہ نمایاں رہے گی۔

اس بات کو مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ تزکیہ کا عمل زمین کے ایک ٹکڑے پر بھی کیا جا سکتا ہے اور ایک انسان کے نفس پر بھی۔ گو ان دونوں چیزوں پر اس عمل کی صورت ظاہر میں مختلف ہوگی، اس لیے کہ میدان عمل الگ الگ ہیں، لیکن حقیقت اور مقصد کے لحاظ سے دونوں عملوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہوگا۔ زمین کا تزکیہ یہ ہوگا کہ اس کو پہلے جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کیا جائے، اس کی ناہمواریوں کو ہموار کیا جائے، پھر اس پر ہل چلا کر اس کو نرم بنایا جائے۔ پھر کھاد اور پانی دے کر اس کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق کسی صالح بیج کو نشو ونما دے سکے اور اس سے پھل اور پھول حاصل ہو سکیں۔

اور نفس کا تزکیہ یہ ہوگا کہ اس کے اندر جو غلط افکار و نظریات جڑ پکڑ گئے ہیں ان کی جڑیں اکھاڑی جائیں؛ جاہلی عادات و اخلاق نے اس کے اندر جو کجیاں اور ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں ان کو درست اور ہموار کیا جائے، تقلیدوں اور رسموں کی پرستش نے اس کو بے حسی اور جمود کے جو روگ لگا رکھے ہیں ان کو دور کیا جائے، فانی لذتوں کی چاٹ نے اس پر جو دون ہمتی اور بزدلی طاری کر دی ہے اس کا علاج کیا جائے تاکہ اس کی آنکھیں

کھل سکیں، اس کا دماغ سوچ سکے، اس کی ہمت ابھر سکے، اس کی عادتیں سنور سکیں اور وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق اپنی ذہنی، اخلاقی، اور روحانی ترقی کے اُس بلند درجہ تک پہنچ سکے جس درجہ تک پہنچنے کی اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر قابلیت رکھی ہے۔

تزکیہ کا اصطلاحی مفہوم | اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو آپ کو نظر آئے گا کہ تزکیہ کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں کچھ ایسا فرق نہیں ہے۔ اُس کا لغوی مفہوم کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا اور اس کو پروان چڑھانا ہے اور اس کا اصطلاحی مفہوم نفس کو غلط رجحانات و میلانات سے موڑ کر نیکی اور خدا ترسی کے راستہ پر ڈال دینا اور اس کو درجۂ کمال پر پہنچنے کے لائق بنانا ہے۔

تزکیہ کا یہ اصطلاحی مفہوم خود قرآن مجید کی مندرجۂ ذیل آیت سے واضح ہوتا ہے:۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔

اور شاہد ہے نفس اور جیسا اس کو بنایا پس اس کو سمجھ دی نیکی اور بدی کی۔ کامیاب ہوا جس نے اس کا تزکیہ کیا اور ناکام ہوا جس نے اسے آلودہ کیا۔

اس آیت سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس کو اس طرح بنایا ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کے رجحانات ودیعت کر کے اس کو یہ صلاحیت بخشی ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان امتیاز کر سکے اور انسان کے لیے کمال اور ترقی کا راستہ یہ ٹھہرایا ہے کہ وہ نیکی اور بدی کی اس کشمکش میں نیکی کا ساتھ دے اور اس کو بدی پر غالب کرنے کی کوشش کرے۔

صحیح شعور کے ساتھ نیکی کو غالب کرنے اور بدی کو مغلوب کرنے کا یہ جہاد قرآن مجید کی اصطلاح میں تزکیہ ہے۔

تزکیہ کے اس مقصد و مفہوم کو سامنے رکھ کے غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جو علوم ہمارے نفس سے براہِ راست بحث کرنے والے ہیں اُن میں علمِ طب ایک ایسا علم ہے جو تزکیہ کے علم سے ایک حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ علمِ طب ہمارے جسم کی بیماریوں اور ان کے علاج سے بحث کرتا ہے اور علمِ تزکیہ ہماری روح کے امراض اور ان کے علاج سے بحث کرتا ہے۔ لیکن اس مشابہت کے باوجود دونوں میں

بڑا فرق ہے۔ علم طب کا دائرۂ بحث نہایت محدود ہے۔ وہ صرف ہمارے نفس کے ایک پہلو یعنی جسم اور اس کے امراض سے بحث کرتا ہے۔ اس کے برعکس علمِ تزکیہ ہمارے نفس کے تمام ظاہری و باطنی گوشوں سے بحث کرتا ہے۔ ہمارا نفس جن قوتوں اور قابلیتوں سے بھی مرکب ہے یہ اُن سب پر تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے اور ان سب کی تربیت کرتا ہے۔ ہمارے اندر جتنے احساسات و جذبات بھی پائے جاتے ہیں یہ سب کو زیرِ بحث لاتا ہے اور اُن سب کی اصلاح کرتا ہے۔ ہمارا نفس جن گوناگوں روابط و تعلقات کے بندھنوں میں بندھا ہوا ہے یہ اُن سب کا جائزہ لیتا ہے اور سب کو ایک خاص اصول و ضابطہ کے تحت منظم کرتا ہے۔ ہمارے دل کے خیالات، ہمارے ذہن کے وسوسے، ہماری طبیعت کے میلانات، ہمارا اٹھنا بیٹھنا، ہمارا کھانا پینا، ہمارے مشاغل اور ہماری دلچسپیاں، ہمارے روز و شب کے معمولات، غرض ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس سے یہ بحث نہ کرتا ہو۔

پھر صرف یہی نہیں کہ یہ ہمارے نفس کے ہر پہلو سے بحث کرتا ہے یا ان کی خرابیوں کو دور کر کے ان کی جگہ پر جو کچھ صحیح ہے اس کو پیش کرتا ہے بلکہ اس کا اصلی کام اس بحث و تمحیص اور اس تعلیم و تلقین سے آگے ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ہمارے نفس کی ہر پہلو سے ایسی تربیت کرتا ہے جس سے ہمارا نفس "نفس مطمئنہ" بن جائے۔

نفسِ مطمئنہ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے علم کی بنیاد ایسے مضبوط یقین پر قائم ہو جائے کہ رنج و راحت اور دکھ اور سکھ کی کوئی حالت بھی خدا کے بارے میں ہمارے اعتماد اور ہمارے حسنِ ظن کو بدل نہ سکے بلکہ ہر حالت میں ہم خدا سے راضی اور مطمئن رہیں۔ اسی طرح ہمارے عمل کی بنیاد ایک ایسی مستحکم سیرت پر قائم ہو جائے کہ تنگی و فراخی اور خوف و طمع کی کوئی آزمایش بھی ہم کو اُس مقام سے نہ ہٹا سکے جہاں اللہ کی شریعت نے ہمیں کھڑا کیا ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے جو کچھ چاہا ہے ہم اس کو پورا کر کے اس کے پسندیدہ بندے بن سکیں۔ یہی نفسِ مطمئنہ تزکیہ کا اصل مقصود ہے۔ قرآن میں اس نفسِ مطمئنہ کا بیان اِن الفاظ میں ہوا ہے۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً
اے ٹھکانے کے نفس، تو لوٹ اپنے خداوند کی طرف تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ تزکیہ میں ایک آمرٹ کی شان بھی پائی جاتی ہے کیونکہ تزکیہ کا

مطمحِ نظر صرف اسی قدر نہیں معلوم ہوتا کہ ہمارا نفس کسی نہ کسی شکل میں اللہ پر لگ جائے بلکہ تزکیہ اس سے آگے بڑھ کر نفس کو خوب سے خوب تر بنانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ تزکیہ صرف اتنا ہی نہیں چاہتا ہے کہ ہمیں خدا اور اس کی شریعت کا کچھ علم حاصل ہو جائے بلکہ وہ اس سے بڑھ کر یہ چاہتا ہے کہ ہمیں خدا اور اس کی صفات کی سچّی اور پکّی معرفت حاصل ہو جائے۔ تزکیہ صرف یہ پیشِ نظر نہیں رکھتا ہے کہ ہماری عادتیں کسی حد تک سنور جائیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ ہم تمام مکارمِ اخلاق کے پیکرِ مجسم بن جائیں۔ تزکیہ صرف اتنے پر قناعت نہیں کرتا کہ ہمارے جذبات میں ایک ہم آہنگی اور ربط پیدا ہو جائے بلکہ وہ اس پر مزید ہمارے جذبات کے اندر رقّت و لطافت اور سوز و گداز کی گھلاوٹ بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ تزکیہ کا مطالبہ صرف اسی قدر نہیں ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہمارا نفس احکامِ شریعت کے تحت آ جائے بلکہ اس کا اصلی مطالبہ یہ ہے کہ ہمارا نفس خدا اور اس کے رسول کے ہر حکم کو اس طرح بجا لائے جس طرح اس کے بجا لانے کا حق ہے۔ اس کا مطالبہ ہم سے صرف خدا کی بندگی ہی کے لیے نہیں ہوتا ہے بلکہ اس بات کے لیے بھی ہوتا ہے کہ ہم خدا کی اس طرح بندگی کریں گویا ہم اسے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مختصر الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ تزکیہ ایمان، اسلام اور احسان تینوں کے تقاضے بیک وقت ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے خدا کو اس کی تمام صفتوں کے ساتھ مانیں، پھر اس کے تمام احکام کی زندگی کے ہر گوشہ میں اطاعت کریں۔ اور یہ ماننا اور اطاعت کرنا محض رسمی اور ظاہری طریقہ پر نہ ہو بلکہ پورے شعور اور گہری للّٰہیت کے ساتھ ہو، جس میں ہمارے اعضاء و جوارح کے ساتھ ہمارا دل بھی پورا پورا شریک ہو۔

اس چیز نے تزکیہ کو ایک مستمر جد و جہد اور ایک مسلسل تگ و دو کی چیز بنا دیا ہے۔ اس میں کوئی توقف یا ٹھہراؤ نہیں ہے۔ اس سفر میں کوئی موڑ یا مقام ایسا نہیں آتا ہے جہاں پہنچ کر آدمی یہ سمجھ سکے کہ بس اب یہ آخری منزل آگئی، یہاں پہنچ کے ذرا سستا لینا چاہیے یا یہیں کمر کھول دینی چاہیے۔ یہ ایک خوب سے خوب تر کی جستجو ہے۔ اس خوب سے خوب تر کی جستجو میں لگا، کو کہیں ٹھہرنے کی جگہ نہیں ملتی۔ جس رفتار سے اعمال و اخلاق اور ظاہر و باطن میں جلا پیدا ہوتا جاتا ہے اسی رفتار سے مذاق کی لطافت، حس کی ذکاوت اور آنکھوں کی بصارت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دامن کے پچھلے دھبے دھو گئے ابھی دامن خ

نہیں ہوتے کہ نگہ بایک ہیں کچھ اور وچھے ڈھونڈھ کے سامنے رکھ دیتی ہے کہ اب انہیں دھوئیے ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

عمل تزکیہ کی اس فطرت نے اس کو نہایت مشکل اور دشوار کام بنا دیا ہے۔ اگر ایک شخص اس کی وسعتوں کو دیکھ کر بالفرض نہ بھی گھبرائے تو بھی یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ تسلسل اس کی کمر ہمت توڑ کے رکھ دے گا لیکن اگر یہ عمل فطری طریقہ پر اس تدریج و ترتیب کے ساتھ کیا جائے جو اس کے لیے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں بتایا گیا ہے تو اس وسعت اور اس لا متناہیت کے باوجود ایک طالب حق کے لیے اس سے زیادہ لذیذ اور پر کشش کام کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس کی وسعتوں کو دیکھ کر دل پر ہراس ضرور طاری ہوتا ہے لیکن اس راہ میں ہر قدم پر غیب سے جو رہنمائی حاصل ہوتی ہے وہ رہنمائی اس قدر تسلی بخش ہوتی ہے کہ ہمت برابر بندھی رہتی ہے اور دل بے حوصلہ نہیں ہونے پاتا۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ جو ہماری طلب میں جدوجہد کرتے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں مزید کھولتے ہیں۔

اسی طرح اس راہ کے تسلسل سفر سے جو تکان لاحق ہوتی ہے اس کا ازالہ ان نئے نئے حقائق و لطائف کے انکشاف سے ہوتا رہتا ہے جو برابر تازہ زندگی بخشتے رہتے ہیں۔ ؏

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

جدوجہد کے تسلسل کے ساتھ اگر تازہ بتازہ فتوحات برابر حاصل ہوتی رہیں اور ہر نئی کامیابی پچھلی تمام کامیابیوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہو تو محنت کی یکسانی اور اس کے تسلسل کے باوجود طبیعت کند نہیں ہونے پاتی بلکہ ہر نیا مرحلہ نئے ذوق و شوق کے ساتھ شروع کرنے کا حوصلہ برابر از خود پیدا ہوتا رہتا ہے۔

اوپر کی تفصیل سے اگرچہ عمل تزکیہ کی فطرت اور اس کی وسعتوں اور مشکلوں کا اندازہ ایک حد تک کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے سارے پہلوؤں کو نگاہ کے سامنے لانے کے لیے مناسب طریقہ یہ ہوگا کہ تزکیہ کے اصل موضوع کو سامنے رکھ کر اس کے سارے اطراف کو احاطہ میں لینے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ جتنے

پہلو اس موضوع کے ہونگے لازماً اتنے ہی پہلو اس تزکیہ کے بھی ہونگے۔ لباس ہمیشہ قامت کو سامنے رکھ کر تراشا جاتا ہے اس وجہ سے اگر قامت کا اندازہ ہو جائے تو لباس کے طول و عرض کا اندازہ آپ سے آپ ہو جائے گا۔

تزکیہ کا موضوع ظاہر ہے کہ نفس انسانی ہے۔ لیکن خود نفس کیا ہے؟ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے۔ اس سوال کو اسلام اور جاہلیت دونوں میں بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ ایتھنز کے معبد کے دروازہ پر مستقلاً کا یہ مقولہ کندہ تھا کہ "اے انسان تو اپنے آپ کو پہچان" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی حکمت میں معرفت نفس کو حصولِ تزکیہ کی راہ میں بنیادی چیز خیال کیا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں بھی یہ مقولہ مشہور ہے کہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ عَرَفَ رَبَّهٗ" (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے خدا کو پہچانا)۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ خود نفس کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ یہ کن صفات اور تقاضوں سے مرکب ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کا تزکیہ کن کن باتوں کا مقتضی ہو گا؟

نفس کے تجزیہ سے ہمارا مطلب یہاں اس طرح کا تجزیہ نہیں ہے جس طرح کا تجزیہ فلسفی لوگ کسی چیز کی ماہیت و حقیقت معلوم کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک نہ تو نفس کی حقیقت و ماہیت معلوم ہو سکتی اور نہ ہمارے مقصد کے لیے اس کی ماہیت و حقیقت کا معلوم ہونا کچھ ضروری ہے۔ ہم صرف نفس کے صفات اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اور اس کے صرف اُن عقلی و اخلاقی پہلوؤں کو سامنے لائیں گے جو علم تزکیہ میں زیر بحث آتے ہیں یا آنے چاہئیں۔

اب آیئے غور کیجیے کہ ہمارے نفس کے (جس کو ہم عربی میں "انا" اور اردو میں "میں" سے تعبیر کرتے ہیں)، کیا کیا پہلو ہیں جن پر تزکیہ کا عمل واقع ہو سکتا ہے اور جن کے تزکیہ کے بغیر اس کا اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پروان چڑھنا ناممکن ہے۔

ہم اپنے نفس پر جب غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے اس کے جو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں اور جو بدیہی طور پر عمل تزکیہ کے تحت آتے ہیں وہ دو ہیں۔

ایک یہ کہ ہمارا نفس ادراک کرتا ہے۔

دوسرا یہ کہ ہمارا نفس عمل کرتا ہے۔

ادراک ہمارے نفس کا اصلی جوہر ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان اینٹ پتھر سے زیادہ وقعت دیے جانے کے لائق نہیں ہے۔ پھر یہ ادراک صرف جزئیات ہی کا ادراک نہیں ہے بلکہ کلیات کا ادراک بھی ہے اور ہمارے نفس کی یہی صفت ہے جو درحقیقت اس کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے ورنہ وہ ایک جانور سے زیادہ اہمیت دیے جانے کا مستحق نہ قرار پاتا۔ یہ کلیات کا ادراک اس کے لیے تعقل و تفکر کی وسیع راہیں کھولتا ہے اور اسی سے اس کے تمام علوم و افکار وجود میں آتے ہیں۔ اسی کی مدد سے وہ ظاہر سے باطن اور مجاز سے حقیقت تک پہنچتا ہے۔ اسی کی رہنمائی میں وہ مخلوق سے خالق اور مصنوع سے صانع تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اسی کی روشنی میں وہ مصنوع کو دیکھ کر صانع کی صفتوں اور اس کی پسند اور ناپسند کا اندازہ کرتا ہے اور پھر اسی کی مدد سے وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے لیے زندگی کی صحیح روش کیا ہے اور اس پر حیثیت ایک انسان کے کیا فرائض اور کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اور ان ذمہ داریوں کو اسے کس احساس مسئولیت اور کس مستعدی و سرگرمی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے؟

اندازہ کیجیے کہ ہمارے نفس کا یہ پہلو کس قدر اہم ہے؟ بدیہی طور پر نظر آتا ہے کہ نفس کے دوسرے تمام پہلو اسی کے تابع ہیں۔ اس وجہ سے اس کے اندر کسی ادنیٰ خرابی کا پیدا ہونا بھی نفس کے سارے پہلوؤں کے درہم برہم ہو جانے کے ہم معنی ہے۔ اگر فکر کا ایک قدم بھی غلط اٹھ جائے تو سارا فلسفہ ہی غلط ہو کے رہ جائے اور نتائج نکالنے میں کوئی معمولی فروگذاشت بھی ہو جائے تو علم کی ساری عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہے اور پھر اس خرابی کے نتیجے کے طور پر زندگی کے ہر گوشہ میں فساد پھیل جائے۔

علم و ادراک کی اِس اہمیت کے سبب سے تزکیہ میں علم کے تزکیہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں مقدم شے یہ ہے کہ پہلے اُن بنیادی سوالات کو طے کر دیا جائے جو فکر و نظر کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہم کیا ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جائیں گے؟ ہم خالق ہیں یا مخلوق؟ مختار ہیں یا مجبور؟ غیر مسئول ہیں یا کسی کے آگے جواب دہ؟ اگر کسی کے آگے جواب دہ ہیں تو اس کی صفات کیا ہیں؟ ہماری زندگی کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے؟ وہ کیا پسند کرتا ہے کیا ناپسند کرتا ہے؟ اگر کسی روش کو وہ ناپسند کرتا ہے

تو اس کے اختیار کرنے والے کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے؟ ان سارے سوالوں کا نہایت قطعی اور حتمی جواب نفس کو علمی کجرویوں اور گمراہیوں سے بچانے کے لیے ناگزیر ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان سوالوں کے جو صحیح اور قطعی جوابات مہیا کیے جائیں ان پر تقلید و جمود اور غفلت و نسیان کا گرد و غبار نہ جمنے دیا جائے اور اگر خدانخواستہ کسی گوشہ میں زنگ لگتا ہوا نظر آئے تو اس کو مانجھ کر برابر صاف کیا جاتا رہے۔

اسی طرح دوسرے پہلو یعنی عمل کو لیجیے۔ یہ پہلو بھی علم ہی کی طرح وسیع ہے۔ انسان کا کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں گذرتا ہے جس میں وہ کوئی نہ کوئی عمل نہ کرتا ہو اور اس کا یہ عمل اس کے نفس پر کوئی برا یا بھلا چھاپ نہ چھوڑتا ہو۔

ان اعمال کے متعلق صرف جائز اور ناجائز ہی کا سوال نہیں پیدا ہوتا بلکہ جائز و ناجائز سے زیادہ اہمیت رکھنے والا سوال ان کے محرکات کا ہے۔ انسان کے اعمال کی محرک کوئی ایک ہی شے نہیں ہوتی ہے بلکہ بے شمار محرکات ہیں جو اس کو عمل کے لیے اکساتے ہیں اور ان میں سے ہر محرک کا عمل کے مزاج پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ ایک ہی عمل ایک محرک کے تحت نیکی کا عمل بنتا ہے اور وہی عمل دوسرے محرک کے تحت بدی کا عمل بن جاتا ہے۔

پھر ہمارے اندر جتنے بھی محرکات ہیں ان کے متعلق یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کن پر اعتماد کیا جائے اور کن پر اعتماد نہ کیا جائے۔

کبھی ہم کوئی عمل ضرورت کی تحریک سے کرتے ہیں مثلاً بھوک لگتی ہے تو کھانا کھاتے ہیں، پیاس لگتی ہے تو پانی پیتے ہیں، تکان محسوس ہوتی ہے تو آرام کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم بہت سے عمل خواہشوں کی تحریک سے کرتے ہیں۔ مثلاً شہرت و ناموری کے حصول کے لیے بہادری کے کام کرتے ہیں، ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لیے رفاہ عام کے کارنامے انجام دیتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس ہمارے بہت سے کام جذبات کے تحت ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم کسی سے محبت یا کسی سے نفرت کرتے ہیں، کسی پر حسد یا کسی پر مہربانی کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہم گہرے تجزیۂ نفس سے یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بہت سے اعمال ایسے بھی ہیں

جن کا محرک، مذکورہ تمام محرکات سے بالاتر ہوتا ہے اس کے تحت ہمارے ایثار و بے غرضی کے وہ سارے کام آتے ہیں جن کے اندر اپنے، باریک ترین تجزیہ سے بھی ہم کسی نفسانی شائبہ کا سراغ نہیں پاتے ہیں۔[1] اس محرک کو ہم روح ملکوتی یا نفس ناطقہ کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

یہ محرکات ہمارے اندر کبھی الگ الگ کام کرتے ہیں اور کبھی ملے جلے ہوئے ہوتے ہیں۔ نیز یہ اپنے فعل میں افراط و تفریط کے بھی مرتکب ہوتے ہیں اس وجہ سے ہر عمل میں ان کا تجزیہ کرنا اور ان پر ان کا محاسبہ کرنا اور ان کو ان کے فطری و شرعی حدود کا پابند بنانا ایک بڑا طویل سلسلہ ہے جس کو ایک خاص نظم کے تحت منظم کرنا تزکیہ کا کام ہے۔

علم و عمل اور جذبات و محرکات کے بعد ہمارے نفس کا دوسرا پہلو اس کے تعلقات و معاملات کا ہمارے سامنے آتا ہے اور یہ بھی اپنی وسعت میں کسی طرح مذکورہ پہلوؤں سے کم نہیں بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

نفس کے تعلقات میں سب سے پہلے جو تعلقات زیر بحث آتے ہیں وہ نفس کا تعلق خدا کے ساتھ اور خود اپنے ساتھ ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو خالق نہیں بلکہ مخلوق تسلیم کرتے ہیں تو یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے کہ خالق کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے اور وہ بالکل صحیح بنیادوں پر کس طرح قائم ہو سکتے ہیں؟

اس کے بعد دوسرے درجہ میں خود اپنے نفس کا معاملہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہم جس چیز کو "انا" یا "میں" سے تعبیر کرتے ہیں وہ بدیہی طور پر بہت سی چیزوں کا مالک یا امین ہے۔ اس کے قبضہ میں ایک جسم ہے، دل و دماغ ہیں، خواہشیں اور حاجتیں ہیں، احساسات اور جذبات ہیں۔ آخر وہ ان ساری چیزوں کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کرے؟ کیا وہ ان ساری چیزوں کا مالک ہے اور اس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کو جس طرح چاہے استعمال کرے یا وہ ان چیزوں کا امین ہے اور ان کو صرف ان حدود کے اندر ہی استعمال کر سکتا ہے جو امانت رکھنے والے کی طرف سے ان کے استعمال کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں؟ اگر دوسری شکل ہے تو

---

[1] یہ ایک مستقل بحث ہے کہ انسان کے اندر کوئی ایسا بالاتر محرک موجود بھی ہے یا نہیں جس کو روح ملکوتی یا نفس ناطقہ سے تعبیر کیا جا سکے۔ ہم اس مسئلہ پر آگے گفتگو کریں گے یہاں اس پر بحث کے لیے موزوں جگہ نہیں ہے۔

پھر یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ وہ حدود کیا ہیں جن کی نگہداشت اس سلسلہ میں لازمی ہے۔ اور پھر انہی کے ساتھ ان ظاہری اور باطنی صفات کا جاننا بھی ناگزیر ہوگا جو اس نگہداشت کے فرض سے کماحقہ عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے۔

خدا اور اپنی ذات کے بعد نفس کا تعلق اپنے ماحول سے جڑتا ہے۔ انسان کے متعلق یہ حقیقت محتاجِ بحث نہیں ہے کہ وہ ایک اجتماعی وجود ہے۔ وہ جب بھی پایا جاتا ہے کسی خاندان کے فرد، کسی معاشرہ کے رکن، کسی ریاست کے شہری کی حیثیت سے پایا جاتا ہے۔ ایک بیل جس طرح اپنے پھیلنے، پھولنے، چڑھنے اور پھلنے پھولنے کے لیے لازماً کچھ سہاروں کی محتاج ہوتی ہے اسی طرح انسان اپنے نشوونما اور اپنی ترقی اور کمال کے حصول کے لیے ان سہاروں کا محتاج ہے۔ ان سہاروں سے الگ ہو کر اول تو اس کا وجود پایا ہی نہیں جاتا اور اگر پایا جاتا بھی ہے تو اس طرح کہ اس کی ساری صلاحیتیں بالکل ٹھٹھر جاتی ہیں۔ اس وجہ سے تزکیہ ہمارے نفس کے سارے تعلقات کا جائزہ لے کر ان کو صحیح بنیادوں پر استوار کرتا ہے تاکہ وہ اس معراجِ کمال تک پہنچ سکے جہاں تک وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے پہنچ سکتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تزکیہ کوئی مفرد اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے اطراف دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمارے نفس کا ہر گوشہ اور ہماری زندگی کا ہر پہلو خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی، عقلی ہو یا عملی، اخلاقی ہو یا اجتماعی و سیاسی، اس کے تحت آتا ہے۔ ہمارے نفس کے تزکیہ کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ اس کے کسی ایک گوشہ میں اجالا ہو گیا بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ہر گوشہ میں روشنی پھیل گئی۔ ہمارا علم بھی جگمگا اٹھا، ہمارا عمل بھی پاکیزہ ہو گیا ہمارے تعلقات و معاملات بھی درست ہو گئے۔

اب ہم تزکیہ کی ان تینوں قسموں — تزکیۂ علم، تزکیۂ عمل اور تزکیۂ تعلقات — پر الگ الگ باب میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

نظامِ اسلامی اور اطاعتِ رسولؐ

حدیث کا مقام نظامِ شریعت میں

(۴)

نعیم صدیقی

تزکیہ کتاب الٰہی کی تبیین کے فریضے کے تحت چوتھا بڑا شعبۂ کار جو انبیاء کو تفویض کیا جاتا رہا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تفویض کیا گیا ہے، تزکیہ کہلاتا ہے۔ اس فریضہ کے نبی پر عائد ہونے کے صاف صاف معنی یہ ہیں کہ نبی صرف کتاب پڑھ کر سنا دینے اور اللہ تعالیٰ کی وحی بندوں تک پہنچا دینے ہی کے لیے نہیں آتا، بلکہ وہ خدا کی طرف سے خاص طور پر جیسے معلّمِ کتاب و حکمت ہوتا ہے، ویسے ہی مزکّی بھی ہو کر آتا ہے

مبالغہ نہ ہوگا، اگر "تزکیہ" کو سارے کارِ نبوت کا اصل مقصود قرار دیا جائے۔ کیونکہ دین و شریعت اور بعثتِ انبیاء کی غایت الغایات فلاحِ انسانی ہے ——— دنیوی فلاح اور اخروی فلاح ——— اور اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ فلاح کا حصول "تزکیہ" پر موقوف ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی (الاعلیٰ)، قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا (شمس)، لہٰذا بالکل بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ انبیاء کی ساری کی ساری سرگرمیاں درحقیقت انسانی تزکیہ کے لیے ہیں۔

تزکیہ کا سیدھا سادہ مطلب زندگیاں سنوارنا ہے۔ اگر ہم لغوی معنی کی تحقیق کرنا چاہیں تو ہمیں اس مصدر کے دو معنی حاصل ہوتے ہیں:۔ ایک منفی دوسرا مثبت۔ منفی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کو کسی مقصد کے لیے منافیات و مفاسد سے پاک کرنا، یا اس کو اُن رکاوٹوں سے خالی کرنا جو اس مقصد کی راہ میں حائل ہوں۔ جیسے کسی زرعی زمین کا تزکیہ یہ ہوگا کہ اس میں ہل چلا کر اس کی سختی کو ختم کیا جائے، اس کے ڈھیلے توڑ دیے جائیں، اس کی ناہمواری کو ہمواری میں بدلا جائے، اس میں اگر سرکنڈے اُگ رہے ہوں تو ان کی جڑیں کھود دی جائیں، اس کی مینڈیں استوار کر دی جائیں، غرضیکہ اسے کاشت کے لیے بالکل تیار کر دیا جائے۔ مثبت معنی یہ ہیں کہ کسی

چیز کو کما حقہٗ نشو و نما دی جا سکے ۔ اس کی ترقی کے تمام لوازم جمع کر دیے جائیں ، اور اسے پروان چڑھانے کے لیے جن تقاضوں کو پورا کرنا ضروری ہے ، ان کو پورا کر دیا جائے ۔ لیکن یہ دونوں معنی ایک دوسرے سے مختلف اور جدا جدا نہیں ، بلکہ باہم لازم و ملزوم ہیں ۔ مفاسد و مضرات سے کسی شے یا وجود کو پاک کرنے کا لازمی نتیجہ اُس کا نشو و ارتقا ہے ، اور کسی شے یا وجود کو نشو و ارتقا دینے کا اوّلین تقاضا اسے مفاسد و مضرات سے پاک کرنا ہے ۔ یہ دونوں معنی لفظ تزکیہ کے اندر باہم گھل مل جاتے ہیں ۔ چنانچہ زکوٰۃ ایک طرف اس معنی میں پاک کرنے والی ہے کہ وہ اُن جذبات کی جڑ اکھیڑتی ہے جو انسانی فلاح میں حائل ہوتے ہیں اور دوسری طرف اس معنی میں نشو و نما دینے والی ہے کہ وہ تعلق باللہ کو ، افراد معاشرہ کے درمیان رابطۂ اخوت و محبت کو اور مجموعی خوش حالی کو ترقی دیتی ہے ۔

انسانی زندگی کا تزکیہ کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ آدمی کے خیر و فلاح کی طرف بڑھنے اور اس کی بہترین صلاحیتوں کے نشو و نما پانے میں جو رکاوٹیں پیش آ سکتی ہیں ان کا ازالہ کر کے وہ تمام اسباب بہم پہنچا دیے جائیں جو انسانی زندگی کے صحیح ارتقا کے لیے ضروری ہیں ۔ اچھے خیالات کے ارتقا میں جو خیالات حائل ہوں ، پاکیزہ جذبات کے ترقی کرنے میں جو سفلی جذبات رکاوٹ بنیں ، اخلاق عالیہ کی بڑھوتری میں جو عادات ، رسوم اور روایات مانع ہوں ، ان کو چن چن کر دُور کر دیا جائے اور انسانی فطرت کی بہترین صلاحیتوں اور قوتوں کے قابل قدر پہلوؤں کے نشو و نما کے لیے تمام لوازم جمع کر دیے جائیں ۔

اس مفہوم کو سمجھنے میں ہم الاحزاب کے چوتھے رکوع سے بڑی مدد لے سکتے ہیں ۔ اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ کے اہل بیت کو خاص ہدایات دی ہیں اور بعض چیزوں سے روکا ہے اور بعض کی بشدت تاکید کی ہے ۔ اور پھر اختتامی کلمہ یہ فرمایا ہے کہ :

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ	اے نبی کے گھر والو ! اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم سے میل کچیل
الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا	دُور کر کے تم کو کمال درجہ میں پاک کر دے ۔

یعنی اللہ تعالیٰ میل کچیل نکال کر کامل درجے کی پاکیزگی سے ازواج مطہرات کو اور پھر ان کے ذریعے امت کی تمام مستورات کو نوازنا چاہتا ہے ۔ ظاہر بات ہے کہ یہاں میل کچیل سے مراد فاسد خیالات ،

جو جسمانی قوتیں رکھتا ہے وہ جسمانی قوتوں سے خدمات انجام دے، جو ہاتھ پاؤں سے کوئی خیر انجام دے سکتا ہے وہ ہاتھ پاؤں سے انجام دے، جو زبان سے دوسروں کے کام آسکتا ہے وہ زبان سے دوسروں کے کام آئے۔

چنانچہ آنحضورؐ نے اپنے دوسرے فرمودات میں واضح کیا ہے کہ راستے سے روڑے اور کانٹے ہٹا دینا، کسی کو بوجھ اٹھوا دینا، کسی کو راستہ دکھا دینا، بلکہ کسی سے خندہ روئی سے پیش آنا بھی صدقہ ہے۔

اس طرح کی احادیث کا منشا تصورِ صدقہ کا تزکیہ ہے۔ جہاں صدقہ کا یہ صحیح اور جامع تصور ذہن نشین ہوگا وہاں صدقہ کی اسپرٹ اور اس کا جذبہ نشو و نما پانے لگے گا اور سوسائٹی پر فلاح کے دروازے کھل جائیں گے۔

چوتھی مثال | آنحضورؐ کی تحریک جب جہاد کے مرحلے سے دوچار ہوئی ہے تو اس مرحلے میں آکر نفسِ انسانی کے بہت سے قابلِ اصلاح پہلو ایسے سامنے آئے ہیں جو دوسرے مراحل میں کبھی نمایاں ہو ہی نہ سکتے تھے۔ چنانچہ ایک طرف قرآن نے اور اس کے زیرِ ہدایت خود آنحضورؐ نے ان پہلوؤں کا تزکیہ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ ترمذی کی یہ حدیث بڑی قابلِ غور ہے:

من خرج عن الطاعة وفارق الجماعة فمات، مات ميتة الجاهلية، ومن قاتل تحت راية عمية يغضب لعصبية أو يدعو إلى عصبية فقتل، فقتلة جاهلية . . . الخ	جو کوئی اسلامی نظامِ اطاعت سے نکل گیا اور جماعت کے ڈسپلن سے باہر ہو گیا اور پھر وہ مر گیا، تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ اور جو کوئی کسی نامعلوم جھنڈے کے پیچھے لڑے اور جس کا سارا جوش قومی و نسلی عصبیت

کی وجہ سے ہو، یا جو جہاد کے لیے کسی عصبیت کی طرف بلاتا ہو اور پھر وہ مارا جائے تو وہ جاہلیت کی موت مرے۔

یہ جہاد کی تنظیمی اور فوجی نظام اور میدانِ جنگ کی سرگرمیوں کا تزکیہ کیا جا رہا ہے۔ آنحضورؐ تنبیہ فرماتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کو بدنظمی اور ہلڑ سے منافات ہے۔ پھر واضح فرماتے ہیں کہ جنگ برائے جنگ کے اصول پر یا پیشہ ورانہ طریق پر، ہر جھنڈے کے پیچھے جا لڑنے والا اور رضائے الٰہی کو پیشِ نظر نہ رکھنے والا سپاہی شجاعت کے جو جوہر دکھاتا ہے جاہلیت کی راہ میں دکھاتا ہے اور مرتا ہے تو کفر پر مرتا ہے۔ اسی طرح وہ جنگجو جس کا سارا جوشِ جنگ کسی قومی و نسلی عصبیت کا نتیجہ ہو، یا جو ایسی کسی عصبیت کی طرف پکارتا ہو تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مرے گا تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو کر نہیں مرے گا۔ بلکہ کفر کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھے گا!

ان کو یہ جواب دیتے ہیں:

قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ رِجْسٌ[۱] وَغَضَبٌ (الاعراف - ۷۱)

تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے ناپاکی اور اس کے ساتھ ساتھ غضب کا ورود تو بس اب ہو چکا۔

یعنی تمہارے دلوں پر ایسی فکری اور جذباتی غلاظتیں تسلط پا چکی ہیں کہ اب یہاں ایمان جیسی لطیف شے کا گذر ممکن نہیں رہا۔ تمہاری زندگیوں میں اب بداخلاقی کی جھاڑیوں کا اتنا گھنا جنگل اُگ چکا ہے کہ یہاں اب گلاب و یاسمن پھلنے سے رہے۔ تم عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو، حالانکہ یہ ایک حالتِ عذاب ہی تو ہے جس میں تم گھر چکے ہو، اور یہ اللہ تعالیٰ کا غضب ہی تو ہے جس میں تم مبتلا ہو رہے ہو اور چاہتے کیا ہو؟

عکس مومنین اور منافقین کا متقابلہ نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے سورۂ توبہ میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَإِذَا مَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِ إِيمَانًا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۔ وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ ۔ (التوبہ - ۱۲۴-۱۲۵)

اور جب کوئی سورۃ نازل ہوتی ہے تو مسلمانوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو باہم گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کے اترنے سے کس کس کے ایمان میں اضافہ ہوا؟ ۔ سو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کا تو ایمان بڑھتا ہی ہے اور وہ اس سے اچھی بشارت پاتے ہیں مگر وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے تو ان کی ناپاکی پر ناپاکی کی ایک اور تہ چڑھ جاتی ہے اور وہ مرتے ہیں تو کافر ہو کر مرتے ہیں۔

دیکھیے آیت نے صاف صاف بتا دیا ہے کہ جن دلوں میں نفاق کی گندگی موجود ہوتی ہے وہ آیاتِ الٰہی کے فیضان سے محروم رہتے ہیں، یعنی آیاتِ الٰہی سے ان کا تزکیہ نہیں ہوتا، بلکہ اُلٹے ان کے دل اور ناپاک ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں ایمان اور عمل صالح کو نشوونما دینے کی صلاحیت بالکل مر جاتی ہے چنانچہ

[۱] رجس کا ترجمہ بلفظ عذاب بھی کیا جاتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ حالتِ رجس خود عذاب ہی ہوتی ہے، یا کم سے کم عذاب کا پیش خیمہ۔ اس آیت میں پہلے رجس کا ذکر ہے اور پھر غضب کا، اس ترتیب کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے خیالات اور اخلاق کی ناپاکی یا تزکیہ سے محرومی کی حالت نمودار ہوتی ہے اور پھر اس کا لازمی نتیجہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ورود ہوتا ہے

وہ دعوائے ایمان کے باوجود حالت کفر میں تے ہیں اور آخرت کی عدالت میں کافر ہی کی حیثیت سے پیش ہوتے ہیں

یہ جس چیز کا ذکر "رجس" کے لفظ سے ان آیات میں کیا گیا ہے، اسی سے انسانی زندگی کو پاک کرنے کا کام ایک نبی سرانجام دیتا ہے۔ وہ رجس کی حالت سے نکال کر افراد کے نفوس کو اور نظام اجتماعی کو طہارت کے مقام پر لاتا ہے۔ یہاں تک کہ بھلائیاں نشوونما پانے کے لیے پوری طرح ایک سازگار فضا چاروں طرف پھیلی ہوئی پاتی ہیں جس میں برائیاں خود بخود سوکھتی اور مرتی ہیں۔

تزکیہ کا صحیح تصور | ہم سنت کے کار تزکیہ کا ایک اجمالی مطالعہ کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ تزکیہ کا صحیح تصور سامنے لے آئیں۔ اس اصطلاح کا جو مفہوم آج کل رائج ہے اسے قرآن کے دیے ہوئے تصور سے کوئی علاقہ نہیں، بلکہ یہ مفہوم قرآنی تصور سے ٹکراتا ہے۔ حقیقت کی توضیح کے لیے ہم یہاں چند ضروری اشارات درج کرتے ہیں:

۱۔ تزکیہ کا کوئی فلسفہ، علم، فن، یا طریق کار کتاب و سنت کی حدود سے ماوراء نہیں ہے۔ انسانی تزکیہ کے لیے جو جو اصول اور طریقے برحق اور ممکن العمل اور نتیجہ خیز ہیں وہ سب کتاب و سنت میں واضح کر دیے گئے ہیں۔ یہی کاوش اور کتاب کا مقصد نزول ہی جب تزکیہ ٹھہرا تو پھر اگر خدا کی کتاب اور نبی کی سنت ہی تزکیہ کے لوازم ہم تک نہ پہنچائے تو اور کہاں سے اس جنس کو ڈھونڈا جائے گا

۲۔ تزکیہ کا کام ایک شعوری عقلی اور استدلالی کام ہے۔ چنانچہ خود قرآن جو تمام تر انسانی خیالات، جذبات اور اخلاق و اعمال کے تزکیہ کے لیے وقف ہے، اس مقصد کے لیے از اول تا آخر استدلال سے کام لیتا ہے اور عقل انسانی کو اپیل کرتا ہے۔ وہ صاف صاف کہتا ہے کہ تزکیہ سے محروم وہ لوگ رہتے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے اور استدلال سے استفادہ نہیں کرتے (ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون یونس: ۱۰۰) پس یہ کوئی ایسا پراسرار کام نہیں ہے جس کے لیے "چشم بند لب بہ بند و گوش بند" کی ضرورت پیش آئے۔ تزکیہ کے لیے آنکھیں بند کرنا نہیں، آنکھیں کھولنا ضروری ہے۔ یہ شعبدوں اور کرامات کی دنیا نہیں ہے کہ آدمی بس مسحور ہو جائے، یہ تو ذہن کی قوتوں کو بیدار کر کے ان سے پوری طرح کام لینے کی دنیا ہے۔ تزکیہ

کوئی خفیہ اسکیم نہیں ہے کہ اسے سینہ بسینہ لے کے چلا جائے اور ایک انڈر گراؤنڈ مہم جاری رکھی جائے یہ خلوت کا راز نہیں، جلوتوں کا معرکہ ہے۔

۳۔ تزکیہ انسانی زندگی کے کسی ایک گوشے میں مطلوب نہیں، ہر بہت سے اور ہر پہلو میں مطلوب ہے۔ یہ تصور بڑا ہی غلط اور گمراہ کن تصور ہے کہ زندگی کے محل میں آپ ایک خاص اندھیری کوٹھڑی تزکیہ کے لیے خاص کر لیں، اور پھر اس کی ظلمتوں میں ڈوب کر الا اللہ کی ضربیں لگاتے رہیں۔ اس کوٹھڑی میں تو خوب جھاڑ بہار ہوتی رہے، اس کی صفائی و درستی کے لیے تو دن رات مشقیں اور ریاضتیں کی جائیں، لیکن باقی سارا محل غلاظتوں سے پٹا پڑا رہے اور اس میں مکھیاں بھنبھناتی رہیں۔ یہ تصور تزکیہ دنیا کے اُن مذاہب کا ہے جنہیں لوگوں نے بگاڑ بگاڑ کر کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ اسلام کا تصور تزکیہ یہ ہے کہ زندگی کا سارا ہی ایوان طہارت و نظافت کی حالت میں رہنا چاہیے۔

آپ فرد کو اپنی تزکیہ گاہوں میں لا کر جب اس کا تزکیہ کرنے بیٹھتے ہیں تو پہلے خدا کے سامنے اس کے عبد ہونے کی حیثیت کو اس کی ساری تمدنی حیثیتوں سے منقطع کرتے ہیں۔ وہ خدا کا عبد ہوتے ہوئے ایک خاندان کا قوام، ایک بیوی کا شوہر، کچھ بچوں کا باپ، کچھ اعزہ کا قرابت دار، کسی منڈی کا تاجر، کسی کارخانے کا مزدور، کسی دفتر کا کلرک، ایک نظام عدالت کا جج، کچھ انجمنوں اور جماعتوں کا رکن، ایک حکومت کا محکوم، ایک قانون کا تابع، ایک معاشرے کی روایات و رسوم کا گرفتار بھی تو ہے۔ اس کے دوسروں سے لین دین ہیں، اس کے حقوق و فرائض ہیں، اس کی قرابتیں اور عداوتیں ہیں، اور وہ بے شمار معاملات کے بندھنوں سے بندھا ہوا ہے۔ ان معاملات ہی سے تو جس پیدا ہوتا ہے اور ان معاملات ہی کے اندر تو وہ تزکیہ کا محتاج ہے۔ جس سماجی فریم کے اندر وہ ہر چہار جانب سے مختلف رشتوں اور تاروں اور کیلوں اور پیچوں کے ذریعے کسا ہوا ہے، اسی فریم کے اندر ٹھیک رہنے کے لیے ہی تو وہ تزکیہ کا محتاج ہے۔ لیکن آپ نے اگر اسے اس فریم سے ہی الگ کر ڈالا تو اب تزکیہ کا ہے کا؟ آپ زندگی کے تالاب کی ایک مچھلی کو اس کے تالاب سے باہر نکال کر اسے تیرنا سکھانا چاہتے ہیں۔ یہ ایک مضحکہ انگیز کارروائی نہیں تو کیا ہے۔

فرد کو تمدن سے الگ کر کے ہم سوچ ہی نہیں سکتے۔ وہ جو کچھ ہے نظامِ تمدن کے اندر رہ کر ہے۔ اس کی

مشکلات جتنی بھی ہیں وہ اسی نظامِ تمدن کے فریم میں رہتے ہوئے ہیں۔ اس کے مسائل یہیں پیدا ہوتے ہیں اور یہیں اپنا حل چاہتے ہیں۔ اس کا حل اگر غلاظتوں سے ستھرا جاتا ہے تو اسی تمدن کے زیرِ اثر۔ اور اسے اگر اپنی روح کی تطہیر مطلوب ہے تو اسی کے اندر رہنے کے لیے! اس حقیقت کو اگر آپ مان لیں تو پھر یہ بھی ساتھ ہی ماننا پڑے گا کہ تزکیہ درحقیقت وہ ہے جو پورے نظامِ حیات کو گندگیوں سے پاک کرکے اس کی صحیح نشوونما کے سامان بہم پہنچا دے۔ مانا کہ تزکیہ کا مدعا بجائے خود ایک ایک فرد کی بہترین صلاحیتوں کو ارتقاء کے راستے پر ڈالنا اور اس راستے سے مختلف مزاحمتوں کو دور کرنا ہے۔ لیکن فرد کا تزکیہ بجز اس کے ممکن ہی نہیں کہ پورے کے پورے نظامِ تمدن کا تزکیہ کیا جائے۔ تزکیہ فلسفہ وعلوم کا بھی ہونا چاہیے، تزکیہ نظامِ تعلیم کا بھی ہونا چاہیے، تزکیہ عدالت وقانون کا بھی ہونا چاہیے، تزکیہ قیادت وامارت کا بھی ہونا چاہیے، تزکیہ مارکیٹ کا بھی ہونا چاہیے، تزکیہ خاندانی فضا کا بھی ہونا چاہیے، تزکیہ ادب اور لٹریچر کا بھی ہونا چاہیے، تزکیہ رسوم واطوار کا بھی ہونا چاہیے ـــــ جب اس طرح نظامِ اجتماعی کا ہر جہتی تزکیہ ہو جاتا ہے تب جا کر ایسی سازگار فضا بنتی ہے جس میں ہر ہر فرد کی پاکیزہ صلاحیتیں نشوونما پائیں اور ایمان وعمل صالح کے پودے پوری طرح برگ وبار لائیں۔

چنانچہ اسلام نے تزکیہ کا یہی وسیع تصور دے کر ایک جامع منصوبہ اپنے سامنے رکھا ہے۔ تزکیہ کی اسلامی اسکیم میں جتنی اہمیت افراد کی ذہنی اصلاح کی ہے، اتنی ہی اہمیت نظامِ جماعت کی مضبوطی ودرستی کی بھی ہے۔ یہاں ایک طرف اگر تزکیہ کے تقاضے نماز سے پورے ہوتے ہیں تو دوسری طرف بعض وسیع تر تقاضے جہاد سے پورے ہوتے ہیں۔ یہاں اگر تزکیہ کا ایک کورس مکّی ہے تو دوسرا وسیع تر اور اعلیٰ تر کورس مدنی بھی ہے۔ یہاں اگر غارِ حرا اور دارِ ارقم کی خانقاہوں سے گزرنا پڑتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ بدر و اُحد کی خانقاہوں کی تربیت پانا بھی ناگزیر ہے۔ یہاں آغاز فاران کی چوٹی سے ایک پکار سے ہوتا ہے اور خاتمہ جمعۃ الوداع کے خطبے پر ہوتا ہے۔ یہاں اگر ایک دن مظلومی کی حالت میں ہمہ تن صبر بن کر گھر چھوڑنا پڑتا ہے تو دوسرے دن قوت وجبروت کے ساتھ اسی گھر میں فاتحانہ داخلہ بھی ہوتا ہے۔

اسلامی تصورِ تزکیہ کی وسعت سمجھ لیں تو پھر آدمی خود بخود یہ حقیقت پا لیتا ہے کہ سارے کا سارا دین

ایک نظامِ تزکیہ ہے۔ قرآن کی ایک ایک آیت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک قول و فعل انسانی تزکیہ ہی کے مطلوب کی طرف رُخ کیے ہوئے ہے۔ تزکیہ دین کی کوئی شاخ نہیں، بلکہ یہی پورے کا پورا دین ہے۔ جب تزکیہ پورے کا پورا دین ہو تو اس کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ کچھ لوگ دین کے باقی کاموں کو شریعت کا نام دے کر الگ چھوڑ دیں اور تزکیہ کو ایک جداگانہ کام کی حیثیت سے طریقت کا نام دے کر اس میں اختصاصی مہارت پیدا کر کے بیٹھ جائیں کہ یہ خاص ڈیپارٹمنٹ ہمارا ہے۔ پھر وہ اس کا ایک مستقل فن مدون کریں اور اس فن کے ماہرین کو تیار کر کے اس پر مامور کریں کہ وہ جا بجا تزکیہ کے ورکشاپ کھول کر بیٹھ جائیں۔

تزکیہ کوئی ٹیکنیکل شغل نہیں ہے۔ اس کا کوئی لگا بندھا کورس اور فارمولا نہیں ہے۔ اس کی کوئی معین ورزشیں اور مشقیں نہیں ہیں کہ جس طرح جمناسٹک کی بعض مقررہ ورزشوں اور مشقوں سے بدن بنایا جاتا ہے اس طرح آپ چند روحانی ورزشوں اور مشقوں سے اپنی روحانیت کو بنائیں۔ یہ زندگی کی ہر جہتی تطہیر اور تعمیر کا کام ہے اور خدا کے انبیاء ساری عمر یہی ایک کام کرتے ہیں، اپنے قول سے بھی اپنے عمل سے بھی، دعوت و تبلیغ کے ذریعے بھی، تنظیم جماعت کی صورت میں بھی، عدالت اور جہاد کے امورِ مہمہ کی انجام دہی کی شکل میں بھی!

چنانچہ قرآن نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کارِ تزکیہ کی وسعتوں کو جن خاص خاص مواقع پر اپنے بیان میں سمیٹ کر پیش کیا ہے ان میں سے ایک اہم موقع پر آنحضور کی بعثت کا مدعا یوں بیان کیا گیا ہے:

— يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ	وہ نبی، ان کو معروف کا حکم دیتا ہے۔
— وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ	ان کو منکر سے روکتا ہے۔
— وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ	اور طیبات کو ان کے لیے حلال کرتا ہے۔
— وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ	اور خبائث کو ان کے لیے حرام ٹھہراتا ہے۔
— وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ	اور ان کے اوپر سے ان کے وہ بوجھ اور بندھن اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے ہیں۔

یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری یہ ہے کہ آپ معروف اور منکر کی تمیز پیدا کر دیں، اور پھر معروف کی طرف بلائیں اور منکر سے روکیں۔ اسی طرح انسانیت کو طیبات اور خبائث کا شعور دلائیں اور پھر طیبات میں سے جن جن چیزوں کو نظام زندگی میں کسی طاقت نے حرام کر دیا ہو ان کو از سر نو حلت کے دائرے میں لائیں اور اسی طرح جن خبائث کو حلال ٹھہرا دیا گیا ہو ان کے گرد پھر حرمت کا جنگلہ کھڑا کر دیں۔ اور مزید یہ کہ فرائض اور ذمہ داریوں کے وہ بوجھ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں، بلکہ کچھ دوسری طاقتوں کی طرف سے بنی آدم پر لاد دیئے گئے ہیں ان سے ان کو نجات دلائیں، اور گمراہ افکار و عقائد اور فاسد رسوم و قوانین کی جو زنجیریں ان کو جکڑ بند کئے ہوئے ہیں ان کا حلقہ حلقہ کاٹ کے رکھ دیں۔ اسی کا نام ہے تزکیہ، تزکیہ کا یہ جامع تصور ہے جو آج صرف قرآن اور اسلام ہی کے سرچشمۂ ملت سے ہاتھ آ سکتا ہے۔

یہی کام ہے جسے اصولی حیثیت سے خود قرآن نے کیا ہے، اور یہی کام ہے جسے تفصیلی حیثیت سے آنحضور نے اللہ کی طرف سے مامور کیے ہوئے مزکی کے منصب پر بیٹھ کر سرانجام دیا ہے۔

ناگزیر ہے کہ اس موقع پر ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کار تزکیہ کو چند مثالوں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ بات تو محتاج دلیل نہیں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بستیاں چھوڑ کر جنگلوں میں دھونی نہیں رمائی، کوئی خانقاہ تعمیر کر کے لوگوں کو دعوت نہیں دی کہ دنیا کے کام کاج اور رشتے ناطے چھوڑ چھاڑ کر آؤ اور یہاں بیٹھ کے "ہو حق" کرتے رہو۔ ترک دنیا کے برعکس وہاں تو مرد دنیا کی سب سے بھاری ذمہ داریاں خود اٹھائی گئیں اور رفقاء سے دین سے اٹھوائی گئیں۔ تزکیہ کا کام دنیا کی زندگی کے فرائض سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ لیا گیا — اور ہر ہر گوشے اور ہر ہر پہلو میں کیا گیا۔

ذیل کی چند مثالیں واضح کریں گی کہ مختلف گوشوں میں تزکیہ کے تقاضے کس کس اسلوب سے پورے کیے گئے۔

پہلی مثال | سیرت انسانی اس ظاہری خول کا نام نہیں جسے آدمی سوسائٹی کو راضی کرنے کے لیے اپنے گرد ایک لباس کی طرح سجا لیتا ہے، بلکہ سیرت کا اصل جوہر وہ قلبی کیفیات ہیں جو آہستہ آہستہ ساری حرکات و سکنات کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہیں۔ سیرت کے اصل جوہر اور اعمال کے بیرونی خول میں اگر منافات ہو تو یا تو خول سیرت کو اپنے مطابق بنا کے رہتا ہے، یا سیرت خول کو تار تار کر دیتی ہے۔

ضمیر اور اعمال کا تضاد ے کر دہرائی زندگی بسر کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس تضاد کی چکی اپنے پاٹوں میں انسانی قوتوں اور صلاحیتوں کو پیس کر رکھ دیتی ہے۔ اس خطرے کا شعور انبیاء کو پوری طرح ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اس بات کی پوری فکر کرتے ہیں کہ اسلامی سیرت لوگوں کے ضمیروں کے سرچشموں سے پھوٹے اور ایک ایک عمل کو سیراب کرے، نہ یہ کہ لوگ باہر کا ایک نسل آراستہ کر کے مطمئن ہو جائیں کہ ہم نے زندگی بنالی۔ لیکن ضمیر اور اعمال کا ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے انبیاء نے کبھی جادو منتر سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنے پیروؤں کے شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ارشاد رسالت:

عن عمر بن الخطاب،	حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی گئی ہے۔
قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آپ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
انما الاعمال بالنیات	اعمال (کی قدر و قیمت) کا دارومدار نیتوں پر ہے۔
وانما لامرئ ما نوی	اور آدمی کے پلے وہی کچھ پڑیگا جس کے لیے اس نے نیت کی۔
من کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ	جس کسی کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہو تو
فھجرتہ الی اللہ ورسولہ	اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوئی۔ اور جس
ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا	کسی کی ہجرت اس لیے ہو کہ وہ دنیا کمائے یا کسی عورت سے
او امرأۃ یتزوجھا	شادی کر سکے تو اس کی ہجرت اسی مقصد کے لیے ہے جس کی
فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ (مشکوٰۃ)	نیت سے اس نے ہجرت کی۔

اس ارشاد کے ذریعے امت کے معزز اعظم نے اعمال کے پیچھے کام کرنے والی نیات و کیفیات کا تزکیہ کرنے کی سعی کی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ باتیں محض نظری رموز و نکات کے طور پر مجلس کی رونق بڑھانے کے لیے تو کہی نہیں گئی ہونگی۔ آنحضور صلعم کے سامنے ایسی مثالیں رہی ہونگی یا ایسے امکانات پیش آتے ہونگے کہ ہجرت کرنے والوں میں بعض لوگ کیسے دوسرے مقاصد دل میں رکھ کر وطن چھوڑیں، اور اپنے فعل کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی حیثیت بھی دیں۔ اس طرح تزکیہ کے نقطۂ نظر سے ایک ایسی بدیہی میدان پیدا ہو گیا۔ چنانچہ آنحضور نے نیتوں کا تزکیہ کرنے کے لیے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ اللہ کے ہاں صرف اس ہجرت کے لیے ہے جو صرف

اس کی رضا کے لیے کی گئی ہو۔

یہ حدیث صرف ہجرت ہی کے معاملے میں تزکیۂ نفس نہیں کرتی ہے، بلکہ جامع اور اصولی حیثیت سے اعمال کے بارآور ہونے کے لیے نیات کی تطہیر کو لازم قرار دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو محدثین نے بڑی اہمیت دی ہے۔ لیکن جہاں تک دوسرے اعمال اور دوسری خدمات کا تعلق ہے، مثلاً تعلیم و تعلم اور انفاق اور جہاد وغیرہ، ان سب کے بارے میں دوسرے موقعوں پر نبی کریمؐ نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ جس کسی نے ان میدانوں میں کوئی بڑے سے بڑا کارنامہ بھی رضائے الٰہی سے صرف نظر کر کے طلب شہرت کے لیے سرانجام دیا تو آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

دوسری مثال | خدا پرستی کا یہ تصور کہ آدمی کو کام دھندوں سے، بدن کے فطری تقاضوں سے اور اعزہ و اقربا سے بے نیاز ہو کر نماز روزہ اور ذکر و تسبیح میں مگن رہنا چاہیے، خوب خوب پھیلا ہے اور بار بار پھیلا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی خدا پرستی کا یہ تصور موجود تھا اور اس کے مجسّم نمونے کاہنوں اور پروہتوں اور راہبوں کی شکل میں موجود تھے۔ اس تصور کا پرتو شروع شروع میں آپ کے بعض بہترین صحابہ پر بھی پڑا۔ اس لیے آپ نے خدا پرستی اور عبادت کے تصور کا تزکیہ کرنے میں بڑی کاوشیں فرمائیں۔ ذیل کی روایت اس مقصد سے وابستہ ہے:

فانی انام واصلی واصوم وافطر وانکح النساء فاتق اللّٰہ یا عثمان! فان لاھلك علیك حقًا وان لضیفك علیك حقًا وان لنفسك علیك حقًا فصُم وافطر وصلِّ ونَم (ابوداؤد)

میں سوتا بھی ہوں، اور نماز بھی پڑھتا ہوں، اور روزہ بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں پس اے عثمان! اللہ سے ڈرو۔۔۔ کیونکہ تمہارے اوپر تمہارے اہل و عیال کا بھی کچھ حق ہے اور تمہارے اوپر تمہارے مہمان کا بھی کچھ حق ہے، اور تمہارے اوپر تمہارا اپنا بھی کچھ حق ہے، پس روزہ رکھو تو افطار بھی کرو اور نماز پڑھو تو نیند بھی لو۔

اس ارشاد کے ذریعے ایک طرف آپ نے بدن اور روح کے تقاضوں میں توازن پیدا کرنے کا شعور دلایا ہے اور دوسری طرف عبادت اور خدا پرستی کے تصور کا تزکیہ کیا ہے۔ پھر آپ کا یہ فرمانا کہ اللہ سے ڈرو

یہ معنی رکھتا ہے کہ اپنے نفس، اپنے اہل و عیال، اور اپنے بھائی کے حقوق کو پورا کرنے کے لیے وقت اور توتیں صرف کرنا بھی اللہ سے تقوی کرنے ہی کا تقاضا ہے۔ اور اگر ادھر کا سارا وقت اور ادھر صرف ہونے والی توتیں بھی اٹھا کر نماز روزہ کے خانے میں ڈال دی جائیں تو اس طرح کی خدا پرستی اور دین داری خلاف تقوی ہے۔

تیسری مثال | صدقہ ایک اسلامی سماج کو بنانے اور مضبوط کرنے اور اس میں خوبیوں کو برقرار رکھنے کا نہایت ہی لازمی وسیلہ ہے، چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین یہ ہے کہ علیٰ کل مسلم صدقۃ۔ ہر مسلمان کو صدقہ دینا چاہیے۔ اس پر سوال کیا گیا :-

ان لم یجد ؟ " اگر اس کے پاس کچھ ہو ہی نہیں تو ؟

فرمایا: یعمل بیدیہ فینفع نفسہ ویتصدق " ہاتھوں سے محنت کرے اور خود بھی نفع اٹھائے اور صدقہ بھی کرے "

پھر پوچھا گیا: اوأیت ان لم یستطع " کیا آپ نے غور فرمایا کہ اگر وہ اس کی طاقت ہی نہ رکھتا ہو تو کیا کرے "

فرمایا ۔ یعین ذا الحاجۃ الملهوف " کسی مظلوم حاجت مند کی کوئی مدد ہی کرے "

پھر سوال ہوا، اوأیت ان لم یستطع " کیا آپ نے اس پر توجہ فرمائی کہ اگر یہ بھی اس کے بس میں نہ ہو تو "

فرمایا: یامر بالمعروف (او الخیر) " دوسروں کو نیکی یا بھلے کام کی تلقین کرے "

پھر پوچھا گیا، ان لم یفعل ؟ " اگر وہ ایسا بھی نہ کر پائے تو ؟

فرمایا: یمسک عن الشر فانها صدقۃ " اپنے آپ کو برائی سے روک رکھے تو یہ بھی اس کی طرف سے صدقہ ہے۔ (الشیخان)

یعنی صدقہ جس معنی میں ہر مسلمان سے مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ اپنے دوسرے بھائیوں اور اپنی سوسائٹی کے لیے اپنی جن جن قوتوں اور صلاحیتوں سے وہ کوئی مفید خدمت انجام دے سکتا ہو انجام دے۔ صدقہ روپیہ خیرات کرنے اور کھانا کھلانے تک ہی محدود نہیں ہے ورنہ یہ سعادت تو صرف دولت مند طبقہ کے لیے مخصوص ہو کے رہ جاتی۔ بلکہ صدقہ کا وسیع اسلامی تصور یہ ہے کہ آدمی میں ابنائے نوع اور اپنے معاشرے کی فلاح و بہبود کا ایک گہرا جذبہ کارفرما ہونا چاہیے اور اس جذبے کے تحت جو مال رکھتا ہے وہ مال خرچ کرے،

جو ذہنی قوتیں رکھتا ہے وہ ذہنی قوتوں سے خدمات انجام دے، جو ہاتھ پاؤں سے کوئی خیر انجام دے سکتا ہے وہ ہاتھ پاؤں سے انجام دے، جو زبان سے دوسروں کے کام آسکتا ہے وہ زبان سے دوسروں کے کام آئے۔ چنانچہ آنحضورؐ نے اپنے دوسرے ارشادات میں واضح کیا ہے کہ راستے سے روڑے اور کانٹے ہٹا دینا، کسی کا بوجھ اٹھوا دینا، کسی کو راستہ دکھا دینا، بلکہ کسی سے خندہ روئی سے پیش آنا بھی صدقہ ہے۔

اس طرح کی احادیث کا منشا تصحیحِ صدقہ کا تزکیہ ہے۔ جہاں صدقہ کا یہ صحیح اور جامع تصور ذہن نشین ہوگا وہاں صدقہ کی اسپرٹ اور اس کا جذبہ نشو ونما پانے لگے گا اور سوسائٹی پر فلاح کے دروازے کھل جائیں گے۔

چوتھی مثال | آنحضورؐ کی تحریک جب جہاد کے مرحلے سے دوچار ہوئی ہے تو اس مرحلے میں آکر نفسِ انسانی کے بہت سے قابلِ اصلاح پہلو ایسے سامنے آئے ہیں جو دوسرے مراحل میں کبھی نمایاں ہو ہی نہ سکتے تھے۔ چنانچہ ایک طرف قرآن نے اور اس کے زیرِ ہدایت خود آنحضورؐ نے ان پہلوؤں کا تزکیہ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ ترمذی کی یہ حدیث بڑی قابلِ غور ہے:

من خرج عن الطاعة وفارق الجماعة فمات، مات ميتة الجاهلية، ومن قاتل تحت راية عمية يغضب لعصبية او يدعو الى عصبية فقتل فقتلة جاهلية ۔۔۔ الخ	جو کوئی (اسلامی) نظامِ اطاعت سے نکل گیا اور جماعت کے ڈسپلن سے باہر ہو گیا اور پھر وہ مر گیا، تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ اور جو کوئی کسی نامعلوم جھنڈے کے نیچے لڑے اور جس کا سارا جوش (قومی، نسلی) عصبیت

کی وجہ سے ہو، یا جو جہاد کے لیے کسی عصبیت کی طرف بلاتا ہو اور پھر وہ مارا جائے تو وہ جاہلیت کی موت ہو۔

یہ جہاد کی تنظیمی اور فوجی نظام اور میدانِ جنگ کی سرگرمیوں کا تزکیہ کیا جا رہا ہے۔ آنحضورؐ تنبیہ فرماتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کو بدنظمی اور ہڑبونگ سے منافات ہے۔ پھر واضح فرماتے ہیں کہ جنگ برائے جنگ کے اصول پر یا پیشہ ورانہ طریق پر، ہر جھنڈے کے نیچے جا لڑنے والا اور رضائے الٰہی کو پیشِ نظر نہ رکھنے والا سپاہی شجاعت کے جو جوہر بھی دکھاتا ہے جاہلیت کی راہ ہی میں دکھاتا ہے اور مرتا ہے تو کفر پر مرتا ہے۔ اسی طرح وہ جنگجو جس کا سارا جوشِ جنگ کسی قومی و نسلی عصبیت کا نتیجہ ہو، یا جو ایسی کسی عصبیت کی طرف پکارتا ہو تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مرے گا تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو کر نہیں مرے گا۔ بلکہ کفر کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھے گا!

پانچویں مثال قرآن مسلم سوسائٹی کو زنا سے پاک رکھنے کے لیے اصولی طور پر کہتا ہے کہ لا تقربوا الزنا۔ یعنی زنا کے قریب نہ جاؤ۔ معاملہ اتنا نازک ہے کہ نہ صرف زنا کرنے کی حد تک نہیں، اس سے دور بھاگنے کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ زنا کے کچھ مبادیات، کچھ متعلقات اور کچھ موجبات ہیں کہ جن سے قرآن روکنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ "فتنۂ نظر" سے خبردار کر کے غضِ بصر کا حکم دیتا ہے، لیکن مبادیاتِ زنا صرف فتنۂ نظر تک ہی محدود نہیں ہیں، ان کا دائرہ تو وسیع ہے۔ قرآن اس دائرہ کے اندر آنے والے ہر ہر فتنہ کا جدا جدا ذکر نہیں کرتا۔ پھر بھی اس کی تعلیم ان سب کو جامع ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے منشا کی وسعتوں کو سمجھ کر سوسائٹی کے دائرۂ صنفیات کے تزکیہ کے لیے وہ ساری باتیں مکمل کر دی ہیں جنہیں قرآن کا معجزانہ اجمال اپنے سینے میں لیے ہوئے تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی مشہور روایت میں وارد ہے کہ:

۔۔۔ فزنا العينين النظر	سو آنکھوں کی زنا (بری نظر سے) دیکھنا ہے۔
وزنا اللسان المنطق	اور زبان کی زنا (شہوت بھری) گفتگو ہے۔
والنفس تمنى وتشتهي	اور نفس (کی زنا یہ ہے کہ وہ) تمنا اور خواہش کرتا ہے۔
والفرج يصدق ذلك كله ويكذبه	اور بالآخر (جنسی اعضا) یا تو اس کی تصدیق کر دیتے ہیں یا تکذیب؟

مسلم کی روایات میں بھی آتا ہے کہ ہاتھ کی زنا اس کا شہوت سے چھونا اور پکڑنا ہے اور پاؤں کی زنا زنا کے لیے چل کر جانا ہے۔ ابو موسیٰ کی ایک روایت میں جسے ترمذی، ابوداؤد اور نسائی نے لیا ہے "فتنۂ خوشبو" کا ذکر ملتا ہے۔ الفاظ یہ ہیں کہ:

وان المرأة اذا استعطرت فمرت بالمجلس فهي كذا وكذا۔	اور جب کبھی کوئی عورت عطر لگا کر کسی مجلس میں آتی ہے تو وہ ایسی ویسی ہے۔

ان روایات کو سن کر ہر انصاف پسند یہ کہے گا کہ واقعی اگر کسی سوسائٹی کا زنا سے پورا پورا تزکیہ کرنا مطلوب ہو تو زنا کے ان سارے ہی مبادیات و محرکات کا سدِ باب کرنا ہوگا۔ اور یہی رسول اللہ نے کیا۔ لیکن کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ صنفی تزکیہ کے ان سارے تفصیلی تقاضوں کا قرآن میں صراحتہً ذکر موجود ہے؟ یقیناً نہیں۔ پھر وہ اقتضائی کونسی ہے جو فتنۂ چشم و گوش، فتنۂ خوشبو، فتنۂ مساس اور فتنۂ رفتار کا سدِ باب کرنے والی ہے؟

وہ اختیاری مرکزی عظم کی ہے جو اللہ کی طرف سے اس خاص منصب تزکیہ پر مامور کیا گیا ہے۔

چھٹی مثال | قرآن تجارتی معاملات کے لیے ایک اصولی اخلاق سکھاتا ہے لیکن وہ روزمرہ معاملات پر ان کو منطبق کر کے نہیں دیتا۔ یہ کام خدا کا نبی انجام دیتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ نے جو اسلامی قانونِ بیع و شراء نافذ فرمایا تھا اس میں سے ہم یہاں ایک مثال دیتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ:۔

نهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیعتین فی بیعۃ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سودے میں دو سودے کرنے سے روکا۔

یہ اور دوسرے احکامِ بیع و شراء جو نبی صلعم نے دیئے ان کا مقصود تاجروں کو اخلاقِ اسلامی سے آراستہ کرنا اور بازار کیٹ کا تزکیہ کرنا ہے۔ ان میں سے کوئی حکم قرآن سے نہیں ٹکراتا، بلکہ درحقیقت قرآن کے بتائے ہوئے اخلاقی اصولوں کا فطری تقاضا قرار پاتا ہے اور قرآن کی مطلوبہ پاکیزہ سماجی فضا بغیر ان احکام کو اختیار کیے قائم ہو ہی نہیں پاتی۔

ساتویں مثال | اسلام ایک ایسی تحریک ہے جو آزمائشوں کی کٹھن وادیوں سے ہو کر گذرتی ہے۔ وہی بات کہ

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

یہاں قدم قدم پر مصائب کا سامنا ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن نے اہلِ ایمان کو اس طرزِ عمل کی تعلیم بھی دی جو نزولِ مصائب کے وقت اختیار کیا جانا چاہیے۔ کہیں بتایا کہ ایسی حالت میں اللہ کا ذکر کیا جائے۔ کہیں صبر و صلوٰۃ کو مصائب کی نازک اندازیوں کے مقابلے میں ڈھال قرار دیا، کہیں تعوذ کی تعلیم دی اور کہیں یہ سکھایا کہ مصیبت آنے پر اس حقیقت کا شعور ذہن میں تازہ کیا جائے کہ ہم سب اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف ہم پلٹ کر جانا ہے جہاد کے مراحل میں سے جب تحریک گذری اور طلبگارانِ شہادت موت کے گھاٹ اترے تو قدرتی طور پر ان کے لواحقین کو صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ عرب میں رواج تھا جیسا کہ پنجاب کے دیہات میں آج بھی رواج ہے کہ عورتیں مردوں پر خاص اہتمام سے نوحہ کرتی تھیں، بین کرتی تھیں، بال نوچتی تھیں اور کپڑے پھاڑتی تھیں۔ مدینہ میں جب جاہلیت کی ان روایات کا ظہور ہوا تو ایک طرف قرآن نے یہ اصولی ہدایت دی کہ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ، بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ یعنی شہدائے راہِ حق کی موت عام لوگوں کی سی

موت نہیں ہے اور ان کا مقام اتنا بلند ہے کہ ان کے بارے میں یہ کہنا ہی اللہ تعالیٰ کو ناگوار ہے کہ "وہ مر گئے" یا "وہ مردہ ہیں" —— وہ تو اپنے آقا کے حضور سے ایک حیاتِ نو کا خلعت پاکر سرفراز ہیں۔ دوسری طرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر نوحہ کرنے کی ممانعت کی، اور یہی نہیں، بلکہ کسی بھی میت پر جاہلی طریقے کا ماتم کرنا ممنوع ٹھہرا دیا۔ فرمایا:

لیس منا من ضرب الخدود و	جس نے منہ پیٹا، گریبان پھاڑا اور جاہلی طریق پر واویلا
شق الجیوب ودعی بدعوی الجاھلیۃ	کیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

یہ رسوم کا تزکیہ تھا یا یوں کہیے کہ غم کرنے اور ماتم کرنے کا تزکیہ تھا۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے لختِ جگر کی موت پر ایک عبدِ مسلم کے اظہارِ غم کا نمونہ قائم کر کے دکھا دیا۔ یہ ہدایت اس صراحت کے ساتھ قرآن میں نہیں ملتی، مگر قرآن کی تعلیم اس کی تصدیق کرتی ہے۔ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ من گھڑت بات نہیں کہہ دی، بلکہ منصبِ تزکیہ پر فائز ہو کر اللہ تعالیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے فرمائی ہے۔ اسے کسی مجتہد کا اجتہاد اور کسی محقق و مفکر کی تفسیرِ قرآن بدل نہیں سکتی اور اس کی جگہ کسی دوسرے کا کوئی قول حجت نہیں بن سکتا۔

آٹھویں مثال حضرت ابوبردہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کے دادا حضرت ابوموسیٰ کو اور حضرت معاذ کو مامور کر کے یمن بھیجا تو ذیل کی ہدایت دی:

یسّرا ولا تعسّرا	لوگوں کو سہولتیں دینا، ان کو تنگی میں نہ ڈالنا،
وبشّرا ولا تنفّرا	ان کو بشارت دینا، نفرت نہ دلانا،
وتطاوعا ولا تختلفا	آپس میں موافقت کرنا، پھوٹ میں نہ پڑ جانا۔

یہ اسلامی حکومت کی سول سروس کے لیے داخلی پالیسی کا چارٹر ہے۔ اس کا مقصود نظامِ حکومت و سیاست کا تزکیہ ہے یعنی جس نظامِ حکومت و سیاست میں یہ چیزیں ملحوظ نہ رکھی جائیں گی اس کا نشوونما کبھی بھی اسلام کے حسبِ منشا صحیح خطوط پر نہ ہو سکے گا۔ ظاہر بات ہے کہ قرآن میں یہ الفاظ کہیں نہ ملیں گے۔ لیکن قرآن نے مسلمان اربابِ حکومت کے لیے جو اصولی ہدایات دی ہیں ان کو جمع کر کے جب آپ دیکھیں گے تو یہ فرمانِ نبوت ان کے فریم میں بالکل ٹھیک بیٹھ جائے گا، کیونکہ آنحضورؐ نے اس کو اخذ قرآن ہی سے کیا ہے۔

اور باریک اور گہرے اشاروں کو صراحت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ قرآن نظامِ سیاست کا جو تزکیہ چاہتا ہے عقل گواہی دیتی ہے کہ وہ اس فرمانِ رسالت کے بغیر عمل میں نہیں آتا پس یہ پالیسی اسلامی حکومت کی اٹل پالیسی قرار پائے گی اور اسے وقتی اور اجتہادی امر قرار دے کر رد کرنے کی جرأت کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔

نویں مثال | مشہور حدیث ہے کہ تم میں سے کوئی اگر منکر کو عمل میں آتے دیکھے تو اسے ہاتھ سے روک دے، یہ اس کے بس میں نہ ہو تو زبان سے اس کے ازالہ کی کوشش کرے، اور اگر یہ بھی اس کے بس سے باہر ہو تو کم سے کم اس سے دلی نفرت کرے۔ یہ آخری درجۂ ایمان ہے۔

قرآن میں صرف اصولی تعلیم یہ ملتی ہے کہ معروف کو قائم کرو اور منکر کو مٹاؤ۔ یہاں جو تفصیل بیان کی گئی ہے وہ بہرحال قرآن میں مذکور نہیں ہے لیکن غور فرمائیے کیا یہ قرآن سے متعارض ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ کسی بھی اصول پر قائم ہونے والی سوسائٹی کو اس کے اصولوں پر استوار رکھنے کے لیے بالکل عقلی طور پر یہ لازم آتا ہے کہ اس کا ایک ایک فرد ان قدروں کا نگہبان ہو جن قدروں سے اس کی بقاء وابستہ ہے اور ان مفاسد کے مقابلے میں وہ سماج کے حلقے کا سنتری بن کے کھڑا رہے جو اس کی تباہی کے لیے حملہ آور ہوتے ہوں۔ وہ سوسائٹی میں اپنے منصب کے لحاظ سے اگر ہاتھ کی طاقت (اختیارات) رکھتا ہو تو ان کو استعمال کرے، اور اگر ہاتھ کی قوت نہ رکھتا ہو تو زبان اور قلم کی طاقتوں سے کام لے، اور اگر یہ بھی نہ رکھتا ہو تو جذبۂ نفرت کے ذریعے مفاسد کا مقابلہ ضرور کرتا رہے۔ جن لوگوں میں خیر کی پاسبانی اور شر کے مقابلے کی تحریک ہی باقی نہ رہے، وہ ایمان کے آخری درجے سے بھی نیچے چلے گئے۔ دل گواہی دیتا ہے، عقل اعتراف کرتی ہے، تجربہ تصدیق کرتا ہے کہ آنحضورؐ کا یہ ارشاد حق ہے اور صد فیصد حق ہے۔ بغیر اس ارشاد پر کاربند ہونے کبھی ہم سوسائٹی کا مجموعی تزکیہ نہیں کر سکتے۔ یہ ارشاد اجتماعی فضا کے تزکیہ کا اہم ترین تقاضا سامنے لاتا ہے۔ قرآن اس ارشاد کو گلے لگاتا ہے، اس کی تعلیم اس کی پشت پناہی کرتی ہے، اس کی حکمت اس کے آئینے میں پوری طرح منعکس ہے۔

نگاہِ بازگشت | یہ حقیقت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ پورے کا پورا دین ——— سارا قرآن اور سارا دفترِ حدیث ——— نظامِ تزکیہ ہے۔ ہر آیت اور ہر روایت تزکیۂ انسانی کے لیے وارد ہوئی ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ مذکورۂ بالا متفرق مثالوں پر ایک نگاہِ بازگشت ڈال کر اس حقیقت کا ادراک کریں کہ قرآن اپنی تعلیم کے ذریعے

تزکیۂ انسانی کے لیے اصولی ہدایات دینے کے ساتھ زندگی کے عملی مسائل میں تزکیہ کا تفصیلی کام سرانجام دینے کا بار اپنے لانے والے پر ڈال دیتا ہے۔ کیونکہ وہی باللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر مامور ہے کہ انسانوں کا تزکیہ کرے — ان کے خیالات کا، ان کے عقائد کا، ان کے اخلاق کا، ان کے معاملات کا، ان کی سیاست کا، ان کی معاشرت کا، ان کی رسوم کا، ان کی جماعت بندی کا، وہ چمن حیات کی ایک ایک روش کو درست کرے، ایک ایک درخت کی شاخ تراشی کرے، اور ایک ایک ہستی کی نشوونما کے لوازم بہم پہنچائے۔ تزکیۂ انسانی کے لیے اوپر جتنے بھی اقوال واحکام پیش کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی من وعن قرآن کے الفاظ میں مذکور نہیں ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی قرآن سے متعارض یا مخالف نہیں ہے، بلکہ ان سے صرفِ نظر کرکے خود قرآن کی اصولی ہدایات کا منشا پورا کرنا اور کسی سماج کو اسلامی خطوط پر نشوونما دینا ممکن نہیں ہے۔ ان ارشادات رسالت کے اندر قرآن بول رہا ہے۔ یہ قرآن کے الفاظ کی نقل نہیں ہیں مگر یہ قرآن ہی کے معانی ومطالب کا حاصل ہیں۔ یہ عین قرآن نہیں، مگر یہ غیر قرآن بھی نہیں! جس خدا نے قرآن کو تزکیۂ انسانی کے لیے سرچشمۂ ہدایت قرار دیا، اسی خدا نے خود اسی قرآن کے ذریعے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مزکی بنا کر آپؐ پر یہ ذمہ داری ڈالی کہ کام کا وہ حصہ جو کتاب کے کرنے کا نہیں ہے بلکہ ایک صاحب کتاب اور حامل کتاب کے کرنے کا ہے، اسے آپؐ بنفس نفیس سرانجام دیں۔ جیسی اتھارٹی اُس طرف ہے، ویسی اتھارٹی اس طرف ہے۔ جو "سلطان" کتاب کے لیے وارد ہوا ہے وہی "سلطان" رسول کے لیے بھی وارد ہے۔ جیسی سند قرآن کو مستند بناتی ہے ویسی ہی سند رسول کو سند بنانے والی ہے۔ پس رسولؐ نے ایک مزکی ہونے کی حیثیت میں جو جو کلمات ارشاد فرمائے ہیں اور جن جن عملی تدابیر کو اختیار فرمایا ہے وہ شریعت اسلامی اور نظام دینی کے مستقل اجزا ہو گئے۔ اب نہ کوئی ان کو ترک کرنے کا مجاز ہے، نہ بدلنے کا، نہ ان کے مقابلے میں اجتہاد کرنے کا! ان کا قبول واتباع لازمۂ ایمان واسلام ٹھیرا۔

اب یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ رسول نعوذ باللہ محض قاصد بن کر نہیں آتا بلکہ وہ کتاب کی تبیین کا ذمہ دار بن کر آتا ہے اور تبیین کتاب کے جامع فرض کو ادا کرنے کے لیے وہ تلاوتِ آیاتؐ، تعلیم کتابؐ، تعلیم حکمتؐ اور تزکیۂ نفوس کے چہارگانہ مناصب پر من جانب اللہ مامور ہوتا ہے۔ اب ہم یہ بتائیں گے کہ ان چہارگانہ ذمہ داریوں کے علاوہ رسول اللہ کے اوپر اور بھی امور مہمہ کی انجام دہی کا بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالا گیا ہے۔ (باقی آئندہ)

مطبوعات

ایک اسلام از جناب ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب برق - پی، ایچ ڈی ۔ شائع کردہ : کتاب منزل لاہور
قیمت مجلد مع رنگین گرد پوش چار روپے ۔

یہ "دو اسلام" اور "دو قرآن" کے بعد برق صاحب کی نئی پیش کش ہے اور بہت سے عجائبات و لطائف کی حامل ہے۔ اس کتاب کا اصل ہدف مُلّا ہے جو ڈاکٹر صاحب کے نزدیک تمام ترقیوں میں حائل ہے، حقیقی اسلام سے ہٹا کر عوام کو اپنے پیچھے لگائے ہوئے ہے، اور اسی کے وجود سے دنیا کی ہر خرابی اور ہر فساد کا ذمہ دار ہے۔ ہماری رائے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ اندازہ بالکل غلط ہے۔ آج کی دنیا ... آج کے عوام مُلّا کی لیڈرشپ میں نہیں چل رہے ہیں، بلکہ ملحد اور مذہب سے منحرف مسٹروں کے زیرِ قیادت ہیں۔ خود ہماری سوسائٹی میں محلّے کی چودھراہٹ سے لے کر مرکزی وزارت تک مُلّا کہیں بر سرِ اقتدار نظر نہ آئے گا۔ مسٹر ملے گا ایک تنگ سے گوشے میں مُلّا کا محض ذہنی سا اثر باقی ہے مگر اجتماعی عملی زندگی سے وہ مدت ہوئی کہ رنگ کیا جا چکا ہے۔ آج وہ سوسائٹی میں اتنا گرا ہوا ہے کہ شاعر، ادیب اور صحافی ہی نہیں، گلی کا ایک لونڈا بھی اس پر بے تکلف پھبتیاں کسنے کی مشق کرتا رہتا ہے۔ پس اس درجہ گر جانے والے مُلّا کے خلاف اتنے فکری لاؤ لشکر سے میدان میں آنا مضحکہ انگیز سی حرکت معلوم ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اصل یا اسلام پر ناوک افگنی کرنے کے لیے مُلّا کو سامنے رکھنا مفید گردانا گیا ہو، تاکہ جو گالیاں وہ دراصل اسلام کو دینا چاہتے ہیں وہ بظاہر مُلّا پرستی نظر آئیں۔

جو کچھ بھی ہو، غریب مرے ہوئے مُلّا کو مارنے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے شاہ مدار بن کر جس حسنِ کلام

لہ جیسے کہ خود آپ ہی نے لکھا ہے کہ "ہمارا مُلّا اس قدر بے کار ہو چکا ہے کہ تکفین و تدفین کی رسومات کے بغیر دنیا کے کسی اور میدان میں قیادت کے قابل ہی نہیں رہا"۔ (مرتب)

سکّہ ریلا ہے، وہ کسی ادیب اور مصلح کو تو کیا، اپنی انسانیت کا احساس رکھنے والے ایک اوسط درجے کے شریف آدمی کو بھی زیب نہیں دیتا۔ ہماری بے لاگ رائے یہ ہے کہ اس میدان میں ڈاکٹر صاحب بازاری تقریر بازوں کی سطح پر اتر آئے ہیں۔ بطور "تبرک" یہاں ہم دو ایک چٹکلے پیش کرتے ہیں:۔

"بے شک، اگر اعمال کے پارسل باندھنے کا کام حضرت مولانا کے سپرد ہوا تو یہ غیر مسلموں کے حالہ جتنے اعمال بھی اٹھا کر باہر پھینک دیں گے اور اپنا ڈھیلا تک ہمراہ لے جائیں گے۔"

"اس طرح ملّا اپنے آپ کو مشیتِ ایزدی کا رازداں، اجارہ دارِ قرآن، اسرارِ لاہوت کا مفسّر اور عقلِ کل کا ہم سر سمجھ بیٹھتا ہے۔ آپ اسے لاکھ سمجھائیں کہ قبلہ! قرآن کی سیاست اور اس حکیم جلیل کی مشیت کو سمجھنا، آپ کے گیارہ اندو سر کے بس کی بات نہیں۔"

"ملّا کے ہاں نعمت کا تصور عجیب ہے۔ وہ دنیوی جنات و عیون، قصور مدمدح، شباب و امتعہ اور مال و ملک کو متاع الغرور سمجھتا ہے اور جمعرات کے حلوے کو نعمتِ صغریٰ اور حورِ جنت کو نعمتِ کبریٰ قرار دیتا ہے۔ مسلمان غلام رہے یا آزاد، فارغ البال ہو یا تنگدست، غلیظ ہو یا صفا پسند جاہل رہے یا عالم، جائے جہنم میں، اس کا منتہائے نظر تو اپنا چودھراہٹ قائم رکھنا ہے اور وہ اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ سارا محلہ پانچ وقت اس کی خدمت میں حاضر ہوتا رہے اور ہر شخص نے ڈیڑھ بالشت داڑھی چھوڑ رکھی ہو۔"

"اللہ نے مار مار کر ہمارا بستر بگاڑ دیا ہے، . . . . . . ہمیں بندروں اور ریچھوں سے زیادہ جاہل بنا دیا، ہمارے چہرے ذلیل اور سیاہ کر دیے لیکن کم سواد و کج نظر ملّا یہی رٹ لگائے جا رہا ہے کہ "ہم چو ما دیگرے نیست"!

"ساری قوم بدعملی کی وجہ سے پٹ رہی ہے اور یہی کہے جا رہا ہے کہ داڑھی بڑھاؤ اور فلاں ورد کرو۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ پٹنے والے سب بے نماز اور داڑھی منڈے ہیں۔ اور پھر بھی نہیں سوچتا کہ اللہ کے پیارے دُم اٹھا کر کفار کے آگے آگے کیوں بھاگ رہے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب یہاں بھی ملّا پر برسے ہیں ایسی ہی گھٹیا زبان میں برسے ہیں معلوم نہیں کہ وہ اس طرح

ملاؤں، پروہتوں اور ڈاکٹروں کی برتری قائم کرنے کی کیسے امید رکھتے ہیں۔

بخلاف اس کے جہاں ڈاکٹر صاحب نے اپنے نظریات کو بالکل اثباتی طور پر پیش کیا ہے وہاں ان کا انداز بیان سنجیدہ بھی ہے اور شگفتہ بھی۔ خاص طور پر جن مواقع پر موصوف اسلام کے عقائد کو اپنی اجتہادی فکر سے مجروح کیے بغیر پیش فرماتے ہیں، وہاں تو تحریر ادبیت اور اثر انگیزی کے لحاظ سے بالکل معیاری ہو گئی ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے جو خاص نظریات پیش فرمائے ہیں ان میں سے ایک وحدتِ ادیان کا نظریہ ہے یعنی تمام ادیان جو دنیا میں چل رہے ہیں اپنی موجودہ صورت ہی میں برحق ہیں۔ حالانکہ یہ بات قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن جو بات کہتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کا دین ہمیشہ سے ایک تھا اور ہر قوم پر وہی ایک دین نازل کیا گیا، لیکن بعض قوموں نے اسے بالکل گم کر دیا، بعض نے اس میں آمیزشیں کر دیں اور بعض نے اس کے اصول و مقاصد، اس کے تقاضوں اور اس کی روح کو مسخ کر دیا۔ اسی وجہ سے دین کی حقیقت کو تازہ کرنے کے لیے بار بار انبیاء آتے رہے اور اب وہی دین آخری مرتبہ محمد صلعم کے ذریعہ مکمل صورت میں زندہ کر دیا گیا ہے جس کے سوا خدا کے دین کو پانے کا اب کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔

وحدتِ ادیان کے تخیل کے ساتھ دوسرا نتیجۂ فکر و کاوش جو ڈاکٹر صاحب نے پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی جملہ مذہبی کتب (تقریباً) اپنی اصلی حالت پر ہیں۔ اس مدعا کو ثابت کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے اپنی وسعتِ مطالعہ کا قابلِ قدر مظاہرہ کیا ہے لیکن اس معاملے میں بھی وہ حقیقت سے دور جا پڑے ہیں۔ قدیم آسمانی کتابوں میں تحریف اس طرح نہیں ہوئی کہ اصل کتابوں کی جگہ بالکل نئی کتابیں لکھ ڈالی گئی ہوں، بلکہ دراصل ہوا یہ ہے کہ ان کتابوں پر جو شرح و حواشی لکھے جاتے رہے ہیں وہ آہستہ آہستہ اصل متن کے ساتھ گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ قدیم کتابوں میں ٹھیک ویسی ہی تعلیم ہدایت جابجا جھلکتی ہے جیسی قرآن میں ہے، اور دوسری طرف ہم بعض مضحکہ خیز مزخرفات بھی ان میں موجود پاتے ہیں۔ کوئی شخص جس نے ویدوں اور گیتا اور بائبل کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کا ہر لفظ قرآن کی طرح کلام اللہ ہے۔ یہ بات صرف وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جو دوسرے مذاہب والوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس بات پر تعجب کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ برق صاحب اپنے مذہب کے علماء پر تو اس بری طرح گرجتے ہیں، مگر دوسرے مذاہب

کے پیروؤں کی یوں خوشامد کرنے لگتے ہیں۔ یہ حرکت تو رُحَمَاءُ عَلَى الْكُفَّارِ اَشِدَّاءُ بَيْنَهُمْ کی مثال ہے

تورات و انجیل کے محفوظ ہونے کے جو عقلی وجوہ برق صاحب نے بیان کیے ہیں، وہ اس طرح کے ہیں کہ مثلاً مذہبی کتب کے بارے میں ان کے پیروؤں میں ایک جذبۂ احترام و تقدس کا موجود ہونا، ان کی حفاظت کا اہتمام پایا جانا، ان کے لیے عشق کا کارفرما ہونا، قابلِ اعتماد راویوں کے ذریعے روایات کو قبول کرنا، تحقیق و کاوش کا مسلسل جاری رہنا، وغیرہ۔ سخت حیرانی ہے کہ جب یہی وجوہ، بلکہ ان سے زیادہ قوی وجوہ احادیث کے معتبر ہونے کے بارے میں پیش کیے جاتے ہیں تو برق صاحب اور ان کے ہم خیال لوگ انہیں رد کر دیتے ہیں، مگر خود ان سے بہت زیادہ کمزور وجوہ کی بنا پر اصرار کرتے ہیں کہ بائیبل کے پرانے اور نئے عہد ناموں کو مستند و معتبر مان لو۔ احادیث میں تو ایک ایک روایت کی سند موجود ہے جس کی کڑیاں براہِ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتی ہیں اور ہر راوی کے حالات کی تحقیق کرنے کے ذرائع موجود ہیں۔ مگر ان کو بے تکلف جھوٹا کہہ دیا جاتا ہے بلکہ ان کا مذاق اڑانے تک سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ مگر جن کتابوں کی کوئی تاریخی سند نہیں پیش کی جا سکتی انہیں کلام اللہ قرار دینے میں ذرا تامل نہیں کیا جاتا۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ نکتہ برق صاحب نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

"ہو سکتا ہے کہ تورات کی کوئی ہدایت بظاہر قرآن کے خلاف نظر آئے یا گیتا کی کوئی آیت آپ کی کسی آیت سے متصادم ہو رہی ہو، اس کا علاج یہ نہیں کہ آپ قلم اٹھا کر تورات و گیتا کی تحقیر و تردید پر فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیں...... بلکہ یہ کہ خود سوچیں، اپنے اہلِ فکر و نظر سے پوچھیں، پادریوں اور برہمنوں سے ملیں، اگر پھر بھی اطمینان نہ ہو تو کوئی تاویل کریں، یا انتظار کریں کہ سائنس کا کوئی انکشاف یا علم النفس کا کوئی جدید نظریہ اس گرہ کو وا کر دے۔"

کیا خوب! احادیث کو اٹھا کر پھینکتے وقت تو آپ ان کاموں میں سے کوئی کام نہ کریں، مگر جب معاملہ تورات اور گیتا کا پیش آجائے تو یہ ساری احتیاطیں آپ کو یاد آجائیں۔ سوال یہ ہے کہ جب رسول اللہ کی کسی حدیث کو آپ رد فرماتے ہیں اس وقت آپ کی یہ وضعِ احتیاط کہاں چلی جاتی ہے؟[1]

[1] ایک مثال "اسی ایک اسلام" میں ملاحظہ فرمایئے:۔ حدیث من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ (بخاری) کو برق صاحب (باقی ص ۲ پر)

برق صاحب کا ایک بڑا اہم نظریہ یہ ہے کہ مومن ہونے کے لیے جس بنیادی کوالیفکیشن کا مطالبہ ہے وہ صرف خدا اور آخرت پر ایمان ہے۔ رسولوں پر ایمان ان کے نزدیک بنیادی شرائط میں شامل نہیں ہے۔ اس پر استدلال آل عمران کی آیات ۱۱۲، ۱۱۳ سے کیا گیا ہے، کیونکہ وہاں ذکر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ ہی کا ہے۔ لیکن برق صاحب کو جاننا چاہیے کہ اگر استدلال کا یہی طریقہ اختیار کیا جائے تو جس موقع پر قرآن نے صرف ایمان باللہ یا ایمان بالآخرۃ کا مطالبہ کیا ہے، کیا وہاں سے یہ استدلال کیا جائے گا کہ بس اور کسی شے پر ایمان لانا ضروری نہیں؟ جی نہیں! قرآن کے بارے میں آپ مانتے ہیں کہ اس کا ایک حصہ دوسرے کی شرح ہوتا ہے اور کسی ایک آیت یا لفظ کو پورے قرآن سے منقطع کر کے نہیں لیا جا سکتا۔ یہی صورت اس معاملہ میں ہے۔ قرآن جس ایمان باللہ کا تقاضا کرتا ہے وہ رسول پر ایمان لائے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ رسول کو الگ رکھ کر آپ خدا کا جو تصور چاہیں دل سے گھڑ سکتے ہیں، ایک واہمہ کو خدا بنا سکتے ہیں، اس میں جو صفات چاہیں بھر سکتے ہیں اور جن صفات سے چاہیں اس کو خالی رکھ سکتے ہیں، جس قانون اور فلسفے کو چاہیں اس سے منسوب کر سکتے ہیں اور جو من مانی شریعت چاہیں، خدا کی شریعت کے نام سے اختیار کر سکتے ہیں۔ اس لئے قرآن صاف الفاظ میں ہر اس شخص کو کافر کہتا ہے جو کسی ایک رسول کا بھی انکار کرتا ہو، چاہے وہ خدا کو ماننے کا اقرار ہی کیوں نہ کرتا ہو۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جس شخص نے کبھی ایک مرتبہ بھی قرآن سمجھ کر پڑھا ہو وہ کیسے یہ بات کہہ سکتا ہے کہ مومن ہونے کے لئے رسول پر ایمان لانا شرط لازم نہیں ہے۔ بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ جس شخص کو اسلام کے متعلق کچھ بھی علم ہے وہ کبھی اتنی بڑی جاہلانہ بات نہ کہہ سکتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر بھی آدمی کا مومن ہونا ممکن ہے۔

لطف یہ ہے کہ دوسری طرف یہی برق صاحب پر زور مطالبہ کرتے ہیں کہ کنفیوشس، سقراط،

(بقیہ حاشیہ) نے رد فرمایا ہے، حالانکہ اس حدیث کو بھی اگر حسن ظن کا مستحق سمجھ کر تامل کیا گیا ہوتا اور اس کی تاویل معلوم کی گئی ہوتی تو ایک دوسری حدیث اس کی وضاحت کے لئے خود کر سامنے آجاتی جس میں سفیان بن عبداللہ الثقفی سے آنحضور اسلام کی حقیقت یوں بیان فرماتے ہیں "قل اٰمنت باللہ ثم استقم" اور پھر قرآن کی ایک آیت اس حدیث کی شہادتِ حقانیت دینے کے لئے سامنے آجاتی ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا..." لیکن یہاں کسی توقف کے بغیر صاف سے صاف حدیث کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔

زرتشت، بدھ، بابا نانک، کرشن اور رام چندر سب کو خدا کے انبیاء تسلیم کرو کیونکہ قرآن بتاتا ہے کہ ساری دنیا میں خدا کے انبیاء آتے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا ذکر قرآن میں نہیں آیا ہے ان میں سے کسی کے بارے میں آخر قطعیت کے ساتھ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک عام فلسفی لیڈر، مصلح، صوفی، یا حکمران عادل تھا، یا نبی تھا؟ آپ ان کے پیروؤں کے جذبات کا لحاظ کر کے ان کا جتنا چاہے احترام کیجئے، مگر کسی کو نبی قرار دینے کے لئے تو قطعی دلائل چاہئیں۔ ہر مذہب کے پیشوا اور ہر عظیم تاریخی شخصیت کو منصب نبوت پر متمکن نہیں مانا جا سکتا۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک بار پھر عمل صالح کی وہی تعریف کی ہے جو اس سے پہلے علامہ مشرقی کر چکے ہیں یعنی جو دنیا میں غالب اور متمکن ہے وہ "عبادی الصالحون" میں شامل ہے۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں: "اقوام فرنگ کو ان کے بلند اعمال کے صلے میں وارث زمین بنا ڈالا" اور "مجھے یقین ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ وہی ہیں جہاں اس کی رحمتیں برس رہی ہیں"۔ پھر وہ اسی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ آگے بڑھ کر یہ فیصلہ بھی کر ڈالتے ہیں کہ آخرت بھی انہی کی ہے جن کی دنیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

"جب ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اللہ نے بعض اقوام کو ان کے اعمال کی وجہ سے دنیا کی جہانبانی، عزت، علم، قوت، دولت اور جلال و جمال جیسے انعامات عطا کر دئے ہیں تو انہی اعمال کی بنا پر انہیں آخرت میں کیوں رسوا کرنے لگا"۔

اس نظریے سے اگر کوئی اختلاف کرے تو ڈاکٹر صاحب نے اس بیچارے کو ہیشتگی ملا کی گالی دے دی ہے اور ساتھ ہی خبردار بھی کر دیا ہے کہ "اجی حضرت مولینا! مجھ پر مت برسیے میں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کر رہا، قرآن سنا رہا ہوں، اللہ کا فیصلہ پیش کر رہا ہوں" (صفحہ) اب فرمائیے کیا کیجئے گا؟ ڈرتے ڈرتے ڈاکٹر صاحب سے بس اتنا پوچھ لیجئے کہ جب حضرت ابراہیم اٹھے تھے تو نمرود صالح تھا یا ابراہیم؟ جب حضرت موسیٰ اٹھے تھے تو فرعون صالح تھا یا موسیٰ؟ جب حضرت عیسیٰ اٹھے تھے تو علماء یہود اور رومی گورنر صالح تھے یا عیسیٰ؟ اور بعثت محمدی کے وقت کسریٰ اور قیصر اور سرداران قریش صالح تھے یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور بلال اور عمار جیسے صحابی؟

دماغی الجھن کا یہ بھی ایک کرشمہ ہے کہ برق صاحب ایک طرف جن لوگوں کو صالح قرار دیتے ہیں دوسری طرف انہی کو مفسد اور غارت گر بھی ٹھیراتے ہیں اور ایک ہی کتاب کے اندر۔ ایک طرف ارشاد ہوتا ہے کہ جو دنیا میں خوش حال اور برسرِ اقتدار ہے وہی مومن صالح ہے اور دوسری طرف سرمایہ داروں، جاگیرداروں، بادشاہوں، برلاؤں اور ڈالمیاؤں اور پیروں کے متعلق یہ رونا بھی رویا جاتا ہے کہ وہ اپنے سرمائے اقتدار اور ذہنی اثر کے بل پر مزے اڑا رہے ہیں۔ ایک طرف ارشاد ہوتا ہے کہ امریکہ نے ٹرکی کے استحکام پر جو ایک ارب ڈالر سے زیادہ روپیہ صرف کیا ہے یہ عین رضائے الٰہی کے مطابق ہے اور قرآن کی اس آیت کا اتباع ہے جس میں زکوٰۃ کا ایک مصرف "مؤلفۃ القلوب" بتایا گیا ہے۔ دوسری طرف انہی صالحین اور متبعین رضائے الٰہی کے متعلق یہ ریمارک بھی پاس کیا جاتا ہے کہ "آج انسان انسان کو مٹانے کے لئے بڑے بڑے مہلک اسلحہ ایجاد کر رہا ہے، آج کاروانِ آدم اوہام وظنون کی تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے"۔ آخر اس ژولیدہ فکری کی کوئی حد بھی ہے؟ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کا اشہبِ قلم ایک بے لگام گھوڑا ہے جو ہر سمت دوڑ رہا ہے اور جدھر رُخ کرتا ہے عقل وخرد کی تمام سرحدیں پار کر جاتا ہے۔

"عملِ صالح" کا یہ تصور اختیار کرنے کے بعد مصنف کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ قرآن کی رُو سے تو کوئی مشرک اور منکرِ خدا کبھی صالح نہیں ہو سکتا بلکہ صالح ہونے کے لیے توحید کا قائل ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس مشکل کو محسوس کرنے کے بعد وہ اپنے تصورِ عملِ صالح پر نظرِ ثانی کرنے کے بجائے قرآن کے تصورِ توحید کو بے تکلف بدل ڈالتے ہیں۔ توحید کی تعریف ان کی زبان میں اب یہ ہے:

> "توحید وہ قوت ہے کہ جس کے بل پر چنگیزی ڈاکوؤں نے چین سے لے کر مصر اور ماسکو سے لے کر دریائے سندھ تک ایک عظیم سلطنت قائم کر لی تھی۔ ان لوگوں کا کوئی مذہب نہ تھا۔ خدا تک کے قائل نہ تھے۔ پاک و ناپاک میں تمیز نہیں کر سکتے تھے، حرام وحلال کے تصور تک سے ناآشنا تھے، لیکن وہ متحد ہو کر عملاً موحد بن گئے اور ان کی تلواروں نے ذہنی موحدوں کی دھجیاں اڑا دیں"۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے زورِ قلم! توحید کے معنی اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک ماننا نہیں بلکہ بس متحد ہو جانا ہے اور یہ وہ توحید ہے جس کو اختیار کر کے آدمی بیک وقت ڈاکو بھی ہوتا ہے اور صالح بھی۔ ڈاکو اس لیے کہ اس نے

فی الواقع ڈاکا مارا، اور صالح اس لیے کہ ڈاکہ زنی کا عمل صالح کر کے دنیا کے ایک بڑے حصے پر غالب جو ہو گیا۔

برق صاحب کی فکر و کاوش کا ایک اور نادر نمونہ "صلوٰۃ" کا جدید تصور ہے۔ انہوں نے ایک اس معنی کو چھوڑ کر جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بتواتر ثابت ہے، لغت کی مدد سے اس کے برعکس معنی کر لیا ہے، مثلاً تعریف و تحسین کرنا، تشہیر، پبلسٹی اور پروپگنڈہ کرنا، دستور العمل پر کاربند رہنا، وغیرہ۔ پھر اس تصور کو قرآن سے ثابت کرنے کے لیے سورۂ معارج کا ایک اقتباس لے کر اس کا ترجمہ بڑی "حکمت" کے ساتھ کر ڈالا ہے ــــ وہ "اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ o وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ . . ." کو اردو کا جامہ یوں پہناتے ہیں:- "البتہ وہ نمازی مستثنیٰ ہیں جو اپنی صلوٰۃ پر قائم رہتے ہیں، یعنی جن کی دولت میں . . ." دیکھیے "و" کا ترجمہ اس موقع پر "یعنی" کے لفظ سے کر کے آیت کو کس طرح اپنے منشاء پر زبردستی ڈھال لیا گیا ہے۔ یہ تو ہوئی صلوٰۃ کی اصل مطلوب اور جامع حقیقت۔ اس کے ساتھ صلوٰۃ بمعنی دعا کو بھی "ایک اسلام" میں جگہ دی گئی ہے لیکن یہ تصریح بھی کر دی گئی ہے کہ:-

"اللہ نے قرآن میں عبادت کی کوئی خاص صورت معین نہیں کی۔ کہیں فرمایا کہ ہمارا ذکر کرو، کہیں صلوٰۃ کی تاکید کی، اور کہیں قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہوئے) تقدیس کا حکم دیا۔ قرآن نے عبادت کی ان تمام صورتوں کو منظور کیا ہے۔"

لیجیے نمازوں کے بارے میں اب تین پانچ کے جھگڑے سے معاملہ آگے نکل گیا۔ ایک نماز ہی کیا، ساری عبادات میں ہر شخص کے لیے اجتہاد کا میدان کھل گیا۔ عبادات کی خاص اشکال اور ان کے قالبوں کی ساخت و پرداخت تو ملا کا کارنامہ ہے، خدا کا دین تو صرف روحِ عبادت چاہتا ہے، چاہے وہ کسی شکل میں ہو! بڑے بکھیڑے سے نجات ہوئی۔

ملا سے ایک بڑی شکایت برق صاحب کو یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ "خبردار علومِ طبیعی کے قریب مت جانا"، چنانچہ تسخیرِ کائنات میں ہم پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور اس شکایت سے ساری کتاب بھری پڑی ہے۔ لیکن علومِ طبیعی اور تسخیرِ کائنات انسانیت کی ایک طبعی ضرورت ہے اور اس میں اصل یہ ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ آدمی نے بغیر کسی دعوتِ آسمانی کے آگ اور پہیے اور دوسری چیزیں ڈھونڈ نکالی تھیں اور بغیر

کسی مذہبی ترغیب کے اس نے بھاپ، بجلی اور ایٹم کی طاقت کو مسخر کر لیا ہے۔ نہ اس سلسلے میں الہامی کتابوں سے نکال نکال کر حکم دکھانے کی ضرورت، اور نہ اس میں رکاوٹ ڈالنا کسی ملّا کے بس میں! جو قومیں علم و ایجاد میں پسماندہ ہو جاتی ہیں ان کے فکر و ایجاد کے بجھے ہوئے دیئے کسی نصب العین کے تیل سے روشن ہو سکتے ہیں، ملّا کو گالیاں دینے سے نہیں، بلکہ اسے پھانسی چڑھا دینے سے بھی نہیں۔ برق صاحب بتائیں کہ ہمارا جو عنصر ملّا کے اثر سے آزاد ہو کر "ترقی" کر رہا ہے اس کے کسی فرد نے کوئی علمی و ایجادی کارنامہ سر انجام دیا؟ ترکی جو ملائیت کو روند کر مغربیت کی راہ پر کئی سال سے اقدام کر رہا ہے ایک سوئی بھی ایجاد کر سکا؟ علمی و ایجادی کارنامے کبھی بھی مقلد اور مرعوب ذہنوں نے سر انجام نہیں دیئے۔

قرآنی آیات کے ساتھ یوں تو کتاب میں جا بجا دل لگی کی گئی ہے، لیکن "اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ" کا یہ مفہوم بہت ہی دلچسپ معلوم ہوا کہ قلمدانِ شریعت اُس رسولِ کریم (جبریل) کے حوالے ہے جو خدائی ہدایت کے مطابق ایک کتاب تیار کرتا ہے اور پھر اللہ اسے ملائکہ کی وساطت سے انبیاء پر نازل کر دیتا ہے۔ گویا رسولِ کریم کا کلام تصنیف ہے اور اللہ کا تنزیل"۔ حالانکہ "قولِ رسولِ کریم" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلعم کو خدا کا کلام جس کی زبان سے سنایا جاتا ہے وہ ایک رسولِ کریم تھا اور اس کے بارے میں اعتماد دلایا گیا ہے کہ وہ صاحبِ قوت ہے، کوئی غیر اُس پر اثر انداز نہیں ہو سکتا، دوسرے تمام فرشتوں پر اس کا حکم چلتا ہے۔ وہ بڑا امانت دار قاصد ہے کہ پیغام کے اندر تصرف نہیں کرتا۔ برق صاحب نے اسے قرآن کا مصنف بنا ڈالا۔

برق صاحب نے علامہ مشرقی، آزاد، اسلم جیراجپوری، پرویز اور چند دیگر "صحیح الفکر مفسرینِ قرآن" (غالباً سرسید، مولانا نیاز فتحپوری، پروفیسر محمد مسعود مراد ہوں گے) کی صف میں اقبال کو کھڑا کر کے بڑا ظلم کیا ہے۔ وہ بیچارا ان عظیم ہستیوں کے ہم پلہ کب تھا۔ اُس کا نام اس فہرست میں شامل کرنا بڑی زیادتی ہے۔

پوری کتاب میں دین کی حقیقتوں اور قرآن کی آیتوں سے وہی معاملہ کیا گیا ہے جیسے کوئی اپنے "میکینو" Meccano سے کرتا ہے، کہ مختلف کیل پرزوں کو جوڑ کر نت نئے ماڈل بناتا ہے، پھر توڑتا ہے تو ایک اور نرالا ڈھانچہ کھڑا کر دیتا ہے۔ یہی "میکینو" کا کھیل ہے جو حقائقِ دینی سے کھیلا جا رہا ہے۔ اور ہمارے اچھے اچھے اسلامی پبلشروں کو کوئی حقیقی مقصد سامنے رکھے بغیر محض روپیہ کمانے کے لیے ہر طرح کی کتابیں چھاپ ڈالتے ہیں۔

اور اس طرح نوجوانوں کے ذہن کو انتشار کے حوالے کر دیتے ہیں۔

برق صاحب وقتاً بعض اچھے احساسات اپنے اندر رکھتے ہیں، اور وہ صدق دل سے بعض خرابیوں سے لڑنا چاہتے ہیں، لیکن ان کا جو بھی نتیجہ فکر سامنے آتا ہے وہ یہی گواہی دیتا ہے کہ ان کے ذہن کے بر خلیئے میں حق و باطل باہم گڈمڈ ہیں۔ وہ بات کسی حق سے شروع کرتے ہیں اور جا پہنچتے ہیں وہ کسی باطل تک۔ وہ چلتے ہیں اچھی نیت سے اور رکتے ہیں جا کر کسی فساد پر۔ چنانچہ موصوف کی تحریر میں ادبی زور کے باوجود حق و باطل کی آمیزش اتنی زیادہ اور نمایاں ہے کہ پڑھنے والے پر بے حد دماغی بوجھ پڑتا ہے۔

تفہیم القرآن جلد اول۔ طبع دوم کے متعلق ضروری اعلان

تفہیم القرآن جلد اول طبع دوم میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے نظر ثانی فرما کر کئی مقامات میں ترامیم و اضافے کر دیے ہیں۔ طبع دوم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ فہرست موضوعات نئی ترتیب اور ترمیم و تنسیخ کے علاوہ طبع اول کی غلطیوں کی بھی تصحیح کر دی گئی ہے۔ متوسط طبقہ کی خواہش کے پیش نظر قسم سوم بھی طبع ہو چکی ہے۔ کاغذ اور سامان متعلقہ کی شدید گرانی اور نایابی کے باوجود ہدیہ میں اضافہ نہیں کیا گیا بلکہ جلد بندی طبع اول سے بھی عمدہ اور مضبوط کرائی جا رہی ہے۔

ہدیہ قسم اول مع بکس -/۱۲/۲۶ خصوصی جلد -/۱۲/۳۲ مطلا سنہری -/۱۲/۳۸

ہدیہ قسم دوم مع بکس -/۴/۱۸ خصوصی جلد -/۱۲/۱۸، -/۴/۲۰ مطلا سنہری -/۴/۲۶

ہدیہ قسم سوم بغیر بکس -/۰/۱۱ خصوصی جلد -/۱۲/۱۱، -/۴/۱۲ (۲ر اضافہ پر بکس بھی مل سکتا ہے)

محصول ڈاک وغیرہ علیحدہ

پتہ: ناظم مکتبہ تعمیر انسانیت گوجر گلی، موچی دروازہ لاہور اور مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ لاہور

ضروری اعلان تفہیم القرآن جلد اول طبع دوم کی فہرست موضوعات کی ترتیب جدید اس قدر مقبول ہوئی ہے کہ طبع اول کے خریداروں کی خواہش پر اسے ۲۹ × ۲۲ سائز کے تقریباً ۶۰ صفحات پر الگ مجلد شائع کیا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں عوام کی سہولت کے پیش نظر الگ سورتیں بھی مجلد شائع ہو رہی ہیں قیمت کا اعلان تیار ہونے پر کر دیا جائے گا۔

ضروری نوٹ: تفہیم القرآن کے متعلق دوسرا ضروری اعلان صفحہ نمبر ۲ پر دیکھیں

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This **book** is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This treatise deals with nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & Its Islamic Solution**—By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56–Price As. 12

7. **The Message of Jama'at-e-Islami**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered in a gathering of the Jama'at which was held on 9th & 10th May, 1947 in Dar-ul-Islam, Pathankot. PP. 36–Price As. 8

8. **What is Islam ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1/8

9. **After Secularism what ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE
(Pakistan)

سرورق ربن پریس، لاہور میں چھپا